

اندازِ بیکانِ اور



راجہ
مہدی
علی
خان

اندازِ بیان اور

راجہ مہدی علی خان



ادبی دنیا لاہور

پیشکش
کتاب
میں
میں
میں
میں
میں

۳۶۰۰	عبدالحمید عدم	رم آہو
۳۶۵۰	،،	زلف پریشان
۲۶۰۰	معین احسن جذبی	فروزان
۲۶۰۰	،،	سخن مختصر
۲۶۲۵	ساحر لدھیانوی	تلخیان
۳۶۰۰	مرتبه قیوم نظر	آفتاب داغ
۳۶۰۰	،، تمکین کاظمی	فریاد داغ
۳۶۵۰	شاہد علی خان	انتخاب کلام ظفر
۲۶۵۰	۵۵ کی بہترین نظمیں حلقہ ارباب ذوق	
۳۶۲۵	بن کپاسی (پنجابی) پرہ جوت کور	
۲۶۲۵	شاد امرتسری	داغ فراق
۶۶۰۰	صفدر میر	درد کے پھول
۱۶۷۵	اختر شیرانی	صبح بہار
۱۶۷۵	،،	لالہ طور
۱۶۷۵	،،	اختر ستان
۱۶۷۵	،،	شہناز
۱۶۷۵	،،	طیور آوارہ
۱۶۷۵	،،	شہرود
۲۶۵۰	ساغر صدیقی	غم بہار
۳۶۰۰	طاہر ایڈیشن	دیوان غالب
۵۶۵۰	نذیر احمد شیخ	حرف پشاش
۳۶۰۰	یحییٰ عیش	نالہ ہائے دل
۳۶۵۰	نذیر احمد	اقبال کے صنائع بدائع

منفصل فہرست طلب کریں

آئینہ ادب چوک انارکلی لاہور

اندازِ بیاں اور

دورِ جدید کے جن شعراء نے زندگی اور سماج کے چھپے ناسوروں پر تیز نشتر چلانے کا آغاز کیا، ان میں راجہ مہدی علی خاں کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ وہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے خاندان سے تعلق رکھتے اور پیدائشی شاعر تھے۔ انہوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر اپنی شاعری کے لئے جو اسلوب اختیار کیا وہ انوکھا بھی ہے اور نرالا بھی۔

”اندازِ بیاں اور“ مرحوم کی ایسی ہی طنزیہ و مزاحیہ نظموں کا مجموعہ ہے، جن میں انسانی جہالت کے بعض حقائق طشت از بام کر کے خواب پرستوں کی ذہنی اڑان کو روکنے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

محمد عبداللہ قریشی

سرورق: سہامی



جملہ حقوق محفوظ

تعداد : ۱۱۰۰

۱۹۶۷ء

قیمت ۴۵۰/-



اہتمام و سول کنٹریس
مرآع سلامہ - آئینہ ادب
چوک بینار - انارکلی - لاہور

(مطبوعہ اشرف پریس لاہور)

فہرست

۱	مقدمہ	۹	از فیضیآغا
۲	پیری نظموں کا دوست	۳۶	از راجہ ہمدانی علی خاں
	(طفلیات لیلیاں)		
۳	چور کی دُعا	۴۸	
۴	خزگو شوں کی غزل	۵۰	
۵	چربجے	۵۲	
۶	پچھل کی توبہ	۵۴	
۷	منہجی جوگنی خدا کی تلاش میں	۵۶	
۸	محترمہ مسز آلدو اور ان کے بچے	۶۱	

۱۰۹	سحرال کی جیل	۲۵
۱۱۴	دو ہمسایاں	۲۶
۱۱۷	جلال نادہ	۲۷
۱۲۱	جمال نادہ	۲۸
۱۲۴	چا چا رحیم اللہ	۲۹
۱۲۶	میرے تکیوں پر کھٹے ہوئے اشعار	۳۰
۱۲۸	ہمیں ہماری بیویوں سے بچاؤ	۳۱
۱۳۱	دستک نیم شب	۳۲
۱۳۵	مشنوی تہر عشق	۳۳
۱۳۹	ڈراما شیریں فراد	۳۴
	(پچہم نے لیس آنکھیں کھول)	
۱۴۴	اننگے کی کتابیں — واپسی پر	۳۵
۱۴۷	دو حرام زادے	۳۶
۱۵۰	بعد ذات انٹرویو	۳۷
۱۵۲	مریدان باصفا	۳۸
۱۵۷	سوروں کی بغاوت	۳۹
۱۶۲	مشنوی تاج دین معراج دین	۴۰

	(محمد جوانی سنس سنس کاٹا)	
۹	نگوٹا	۶۶
۱۰	پھول اور کانٹا	۶۶
۱۱	بنتِ عم	۶۷
۱۲	درزن اور لارڈ کرزن	۶۹
۱۳	بھائی بہن	۷۵
۱۴	فیصلہ	۷۶
۱۵	آخری گالی	۷۷
۱۶	مولوی صاحب کا خجاب	۸۰
۱۷	ادیب کی محبوبہ	۸۲
۱۸	ضرورتِ رشتہ اور تصویریں	۸۵
۱۹	ایک اور ضرورتِ رشتہ اور تصویریں	۹۰
۲۰	غندھے	۹۶
۲۱	ایک آنکھ والا	۹۸
۲۲	اُس سے اور اُسی سے	۱۰۰
۲۳	میاں کے دوست	۱۰۳
۲۴	بیوی کی سہیلیاں	۱۰۶

۲۰۱	۵۵ - تنویری قہر الیہاں
	زند کے زند رہے
۲۲۸	۵۶ - خانہ بہرہ ماہان گذاشت
۲۲۲	۵۷ - ایک اور مہمان
۲۲۵	۵۸ - راجندر بیدی اور چور
۲۲۹	۵۹ - حساب دشمنان در دل
۲۵۱	۶۰ - زند کے زند رہے

۱۶۷	۴۱ - ایشان
۱۶۸	۴۲ - کلاہ پوش — بہت بڑا آنسو
۱۶۹	۴۳ - آسمان کا بلبہ
۱۷۰	۴۴ - ایک چہلم پر
۱۷۵	۴۵ - پارٹیشن
	(جنت میں بے چین رہے تھے، دوزخ میں آرام کیا)
۱۷۸	۴۶ - پیر اور مرید
۱۸۰	۴۷ - اچی پیلے آپ
۱۸۲	۴۸ - اڈنگھ
۱۸۳	۴۹ - میں اور شیطان دیکھ رہے تھے
۱۸۵	۵۰ - جہنم میں غنڈے
۱۸۷	۵۱ - جب شام جنت میں ہوئی
۱۸۹	۵۲ - جنت میں حسینوں کی بھوک ہڑتال
۱۹۶	۵۳ - شاعر خدا کے دربار میں
۱۹۸	۵۴ - میرا دوست

مقدمہ

زندگی کی کردوٹوں سے تحصیلِ مسرت کا رجحان، حیرت، استعجاب اور تجسس کے ایک شدید جذبے کے تابع ہے اور یہ جذبہ اس بات کا تقاضا ہے کہ ناظر، زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ایک نئے زاویہ نگاہ سے مطالعہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بچے کے لئے تحصیلِ مسرت کے امکانات زیادہ روشن ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے مختلف مظاہر کو جب پہلی بار دیکھتا ہے تو اسے وہ حیرت آمیز مسرت حاصل ہوتی ہے، جو زندگی کا متذرعہ گراں بہا ہے۔ اس کے برعکس ایک سے ماحول کو بار بار دیکھتے چلے جانے سے بے رنگی اور یکسانیت کا احساس پیدا ہوتا ہے جو مسرت کے لئے نہرِ قاتل ہے۔ فن کی دنیا میں بالخصوص تکرار اور تلبق سے یکسانیت اور بے رنگی مسلط ہوتی ہے اور خط یا مسرت کی تحصیل ناممکن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہر اچھا فن کار زندگی کو نہ صرف ایک نئے زاویے سے

دیکھتا ہے بلکہ اپنے فن کی مختلف منازل پر ہر بار ایک نئے زاویہ نگاہ کو وجود میں لاتا ہے۔ نتیجتاً زندگی کے تو کیلے کنارے اس طور ابھرتے ہیں کہ نہ صرف خود فن کار اپنے عمل تخلیق سے محفوظ ہونے لگتا ہے بلکہ ناظر کو بھی جالیاتی حلقہ پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پس عام زندگی کے علاوہ فن کی دنیا میں بھی مسرت کی تحصیل زاویہ نگاہ کی تازگی اور نئے پن کے بغیر ممکن نہیں۔ اس ضمن میں نیچے کا طریق کار مسرت کے متلاشیوں کے لئے مشعل راہ کا کام دے سکتا ہے۔

راہ ہمدی علی خاں کی نظمیں تفصیل مسرت کی جو ایک عمدہ مثال پیش کرتی ہیں، اس میں زندگی اور اس کی کرداروں کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی وہ روش ہی نہیں ملتی جو بچپن کا طرہ امتیاز ہے بلکہ زندگی سے مسرت اخذ کرنے کا وہ رجحان بھی ملتا ہے جو بچے سے مخصوص ہے۔ جہاں تک زندگی کے عام مظاہر کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا سوال ہے، راجہ صاحب کے ہاں اس رجحان کے نقوش بہت روشن ہیں۔ اول تو یہی دیکھئے کہ نظم میں ان کا میدان سنجیدہ شعری تخلیق کی بجائے مزاحیہ تخلیق ہے اور مزاح کی نو تازگی اور نئے پن کے بغیر ممکن ہی نہیں بے شک ایک سنجیدہ شعری تخلیق کی عظمت اس بات میں ہے کہ یہ گزرگاہ خاص و عام سے ہٹ کر ایک نئی راہ تراشتی ہے تاہم اگر یہ نئی راہ نہ تراشتے تو بھی کم سے کم گوارا اور قابل برداشت ضرور ثابت ہوتی ہے لیکن مزاح کی دنیا کا انداز قطعاً نرالا ہے۔ مزاحیہ تخلیق

اگر ہنسی کو بیدار نہیں کرتی تو ناکامیاب ہو جاتی ہے اور ایک لحظے کے لئے بھی بہداشت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مزاحیہ تخلیق کی صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ کامیاب یا ناکامیاب۔ کسی درمیانی منزل کا تصور ناممکن ہے۔ ایک لطیفے کا تجربہ کریں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کی تمام تر کامیابی اس کے "اچانک پن" میں ہے۔ اسی لئے جب ایک بار لطیفہ سن لیا جائے تو دوسری بار سننے پر اس کا اثر باقی نہیں رہتا، نیز اگر لطیفہ کسی غیر عمدی کا احساس نہیں دلاتا تو ناکامیاب ہو جاتا ہے راجہ ہمدی علی خاں نے اپنی نظموں میں مزاح کی تخلیق کی ہے اور انہیں اس خاص میدان میں جو کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ راجہ صاحب نے زندگی کے عام مظاہر کے چھپے ہوئے پہلوؤں پر روشنی کا ایک نیا پرت ڈالا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے ایک ایسے نئے مقام سے گرد و پیش پر نظر دوڑا ہے کہ خشن، کردار یا واقعہ کے مضحک پہلو سب سے پس منظر کی نگاہ کا مرکز بنے ہیں، پھر جب وہ ان مضحک پہلوؤں کو ناظر کے سامنے پیش کرتے ہیں تو گویا مسرت کی تخلیق کرتے ہیں۔ اور ناظر ان کا ہم فہم فہم کران مضحک پہلوؤں سے محفوظ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یوں اس مسرت کا بچپن کے ساتھ ایک گہرا تعلق بھی ہے۔ بچہ دو طرح کی مسرت تک رسائی پاتا ہے۔ ایک تو اس مسرت تک جو حیرت و استعجاب کے باعث وجود میں آتی ہے۔ مثلاً جب وہ ایک خوبصورت پھول، جانور یا مہملے کو حیرت سے دیکھتا ہے تو فطر مسرت سے تاج اٹھاتا ہے

دوسری طرف بچے کی مسرت زندگی کے مضحک پہلوؤں سے متحرک پاتی ہے مثلاً جب وہ کسی شے کو ٹوٹے، بگڑے یا بد شکل ہوتے دیکھتا ہے تو بے اختیار ہنسنے لگتا ہے۔ راجہ ہمدی علی خاں نے اپنی نظموں میں زندگی کے عام مظاہر کے مضحک پہلوؤں کو پیش کر کے مؤخر الذکر مسرت کے حصول کے مواقع ہم پہنچائے ہیں اور اگرچہ ناظر کا ذوق مزاح بلند تر حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم ناظر کی ہنسی ناہمواریوں کے وجود ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ ناہمواریاں بچپن سے تعلق بگڑی ہوئی یا بد شکل صورتوں ہی کا ایک ارتقائی روپ ہیں دناہمواریوں سے تحصیل مسرت کے اس رجحان کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

راجہ ہمدی علی خاں کی نظموں میں پرانی اشیاء کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے کا وہ رجحان ہی نہیں ملتا جو ناہمواریوں کو سطح پر لا کر تحصیل مسرت کا موجب بنتا ہے بلکہ ان کے ہاں زندگی کے مظاہر، کیفیات اور عناصر سے مسرت کا آخری قطرہ تک پنچوڑ لینے کی وہ روش بھی موجود ہے۔ جو اردو نظم کی عام دگر سے ہٹ کر معرض وجود میں آئی ہے۔ اردو غزل میں غم، کسک اور نفی کا رجحان عام طور سے رائج رہا ہے اور اردو نظم نے زیادہ تر جدید دور سے قبل نظریات کی تبلیغ کے لئے ایک حربے کا کام دیا ہے۔ البتہ جدید نظم میں اندر کی دنیا سے متعارف ہونے اور داخلی غم کو سطح پر لے آئے کا وہ رجحان ابھر آیا ہے جو اب تک صرف غزل سے خاص تھا۔ اور نتیجہً اردو نظم نے ایک ہی جست

میں فن کی بہت سی منازل کو طے کر لیا ہے۔ شاید یہ ہمارے مخصوص فلسفیانہ انداز کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں فراوانی کے باوجود زندگی کی نفی کا رجحان مسلط رہا ہے اور فرد نے ارضی عوامل سے قطع نظر کر کے حیات جاوید کی تلاش میں اپنی تمام تر مسماعی کو وقت رکھا ہے۔ زندگی بعد از موت کے تصور کی مقبولیت کی وجہ غالباً یہی ہے۔ پھر حیات جاوید کی تلاش میں زندگی کی عام مسرتوں اور رغباتوں سے کنارہ کش ہونے کا جو رجحان ابھر اور جسے ہمارے مخصوص فلسفیانہ اور مذہبی نظریات نے فروغ دیا، خود ہمارے ادب، بالخصوص شاعری پر بھی اثر انداز ہوا اور ایک ناآسودگی، غم اور خلش نے ہماری اصنافِ شعر یا مخصوص غزل میں مستقل جگہ بنالی۔ اس پس منظر میں راجہ ہمدی علی خاں کی نظموں کا مطالعہ کریں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس شاعر نے زمینی مسرت کی نفی کرنے کی بجائے ایک مثبت طریق کار کو حوزہ جان بنایا ہے اور زندگی کے مظاہر سے کنارہ کش ہو کر اپنی ذات میں سمٹنے کی بجائے زندگی کے مظاہر کی طبعیت پیش قدمی کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عظیم شاعری دروہندی اور غم کی پیداوار ہے اور اسی لئے بذلہ سخن (WIT) کی شاعری کو فن کے زینے پر کوئی بلند مقام حاصل نہیں۔ تاہم یہ شاعری فرد کو زندگی اور اس کی مسرتوں سے قریب تر لانے کا جو ضروری فیصلہ سرانجام دیتی ہے اس کی اہمیت کسی طور بھی نظر انداز نہیں ہو سکتی۔ ایک ترپہی دیکھ کر یہ عمل

ذہنی اور جسمانی صحت پر دالیا ہے اور ناظر کو ایک صحت مند نقطہ نظر سے آشنا کرتا ہے۔ دوسرے فن میں زوال اس وقت نمودار ہوتا ہے جب وہ اپنے ارتقائی مراحل پر پہنچنے کے بعد اپنے منبع یا زمین سے منقطع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ زمین اور اس کے مظاہر سے مشتق قائم رکھنے کی یہ روش (جسے راہِ ہمدی علی خاں نے پیش کیا ہے) فن کی سلامتی کے لئے ضروری ہے کہ یہ فن کار کو اپنے پس نظر سے نا آشنا نہیں رہنے دیتی اور اس کے فن میں اسد گرد کے ماحول کا شعور سرا وجود رہتا ہے۔

ماجد ہمدی علی خاں کے ان مسرت اخذ کرنے کار جہاں ان نظموں میں بہت نمایاں ہے جو عورت اور مرد کے رابطہ یا ہم سے متعلق ہیں۔ اس ربط کے سلسلے میں شادی سے قبل کی جذباتی محبت اور شادی کے بعد کی غیر جذباتی مسکین ہمدردانہ وابستگی کو راہِ صاحب نے اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے اور اپنی مخصوص افتادِ طبع کے زیر اثر اس ربط کے ان پہلوؤں کو زیادہ اہمیت دی ہے جو زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں اور ناہمکاریوں سے متعلق ہیں نہ کہ ان پہلوؤں کو جو نا اُسودگی، غم اور محرومی کے باعث ایک انوکھی شدت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک طرح سے دیکھیں تو اس میں انسان کی عظمت بھی ہے کہ وہ اپنی جذباتی کیفیات سے خود کو الگ تھلاک کر کے الیٰ پو ایک منجھا ڈالے اور پھر ہنسنا شروع کر دے۔ یہی اس طریق کار کی دو صورتیں

ہیں۔ ایک تو غالب کا سا انداز جہاں مزاح ایک شدید یا سبب اور احساسِ محرومی سے تحریک لیتا ہے اور ایک ایسی صورتِ حال کو معرضِ وجود میں لاتا ہے جہاں انسواءِ تبسم ایک دوسرے سے ہلکا رہ جاتے ہیں۔ یہ فن کی معراج ہے۔ دوسری صورت ایک ایسے باشعور انسان کا طرزِ عمل ہے جو جذباتی روابط کی ناہمکاریوں کو پالتا ہے اور پھر ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ ان کی تقاب کشائی کرنے لگتا ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر ہوا یہ صورتِ حال راہِ ہمدی علی خاں کے کسی شعوری عمل کا نتیجہ نہیں، بلکہ ان کی افتادِ طبع اور ایک مخصوص ادبی نگاہ کی پیداوار ہے۔ وہ اس طرح کہ راہِ صاحب کے ہاں ایک بچے کی سی معصومیت اور کھنڈرا پن ہے۔ جس کے تحت وہ زندگی سے ہم کنار ہوتے اور اس کے مظاہر کے ساتھ گویا "آٹھ پوٹی" کھیلنے چلے جاتے ہیں۔ اس طرزِ عمل نے محبت کے موضوع کے سلسلے میں ان کی نظموں پر گہرے اثرات ترسم کئے ہیں۔ اور محبت کی طرف ان کے رجوعِ عمل کو اس طور متاثر کیا ہے کہ اس میں مہنی، چہل، خوش باشی اور محبت کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کا رجحان ابھرا ہے نہ کہ محبت کے غم میں ڈوبنے اور دنیا جہاں سے الگ تھلاک ہو کر محبت کی کرناک کیفیات کو پیسنے لگانے کا رجحان۔ چنانچہ ان کی اس قسم کی نظموں میں لڑکے اور لڑکی کی محبتِ تفصیل مسرت کی ایک دلچسپ مثال پیش کرتی ہے۔ لیکن ہے بعض بگ یہ کہیں کہ اس

طرح تو پیرا بہ صاحب کی پیش کردہ محبت میں سستاپن ہے جو کسی
 طور بھی قابل قبول نہیں لیکن درحقیقت بات اس سے قدرے مختلف ہے۔
 اگر تو را بہ صاحب محض دونوں جوانوں کی محبت کے چند سطحی پہلوؤں تک
 محدود رہتے تو اعتراض جائز تھا لیکن یہاں لطفت کی بات یہ ہے کہ را بہ
 صاحب نے ان سطحی پہلوؤں کو پیش کرتے وقت محبت کی جذباتیت کو
 ذائقہ کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ محبت کی ناہمواریوں کو اس انداز سے پیش
 کرتے ہیں کہ جذباتی کیفیات مضحکہ خیز نظر آنے لگتی ہیں اور ناظر، شاعر
 کے، شرارت بھرے تبسم کا سہارا لے کر ہنسنے لگتا ہے۔ کورٹ شپ کے
 ایام سے متعلق را بہ صاحب کی یہ چند نظمیں دیکھئے۔ ان نظموں کے مطالعہ
 سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر نے محبت کے پُر مسرت پہلوؤں کو ہی
 زیادہ تر اپنی نگاہ کا مرکز بنایا ہے اور محبت کی ان کر بناک کیفیات کو منظر
 عام پر لانے کی کوشش نہیں کی جو فراق، ناکامی یا حادثے سے وجود
 میں آتی ہیں۔ اور یہ شاعر کی افتادِ طبع کے مطابق بھی ہے۔

تمہی جا کوٹھے پر سو سن میں تو بس اب جا لگی
 تیرے کوئی داں جائے گا میں باز آ چکی

جب بھی میں اوپر ہوں جاتی
 سامنے اس کو ہوں پاتی

وہ نگوڑا مجھ کو تک کر جانے کیوں کہتا ہے ہائے
 اب کو سو سن کوئی کیا خاک اس کو کٹھے پہ جائے
 دس دفعہ میں کل گئی جب
 کیا تباؤں ات مرے رب
 دس دفعہ ہی میں نے پایا اس کو اپنے سامنے
 مجھ کو تک تک کر دکا کم بخت دل کو تھامنے
 آذرا کوٹھے پہ جائیں
 آدھی چٹری سکھائیں
 اس نگوڑے مردوے کو منہ لکائیں گے نہ ہم
 وہ جوہر ہو گا آدھر چٹری سکھائیں گے نہ ہم

”نگوڑا“

مردو :- اور دیکھئے اک نظر بناہ پرور
 کرنے کو تشریف لائے ہیں مردو
 ذرا اپنے چہرے سے زلفیں ہٹا کر
 ہمیں دیکھئے اک نظر مسکرا کر
 شبیتوں پہ کپڑے سٹے جا رہے ہیں
 مردانوں پہ جھٹے کئے جا رہے ہیں

جہیز اپنا سینا اری اے حینا

مگر میرا چاک گریباں نہ سینا

نگاہیں اٹھا کر ادھر دیکھ دزدن

کھڑا ہے ترے سامنے لارڈ گردن

رضیہ :- چلو چھوڑو مسٹر یہ بکواس کینک

تم اس گھر میں تڑپو گے بے آس کینک

کبھی لڑکیاں ایسے پھنستی نہیں ہیں

ہمساز تو بے درد ہنستی نہیں ہیں

سرور :- مچلتا ہوں کب تک دُور رہ کے

قریب آؤں میں ایک دو تین کہہ کے

رضیہ :- کم از کم رہو سو قدم دُور مجھ سے

چپت ورنہ کھاؤ گے بھر پور مجھ سے

چلے آئے پھر عشق کا ساز لے کر

بلاؤں میں امی کو آواز دے کر، وغیرہ

دزدن اور لارڈ گردن

لڑکا :- نہیں آتی ترکیا ہے، ہم نہیں انگلش پڑھا دیں گے

کتا ہیں مت رنگا نا سب کی سب ہم کل ہی لادیں گے

لڑکی :-

نہیں اس کی ضرورت کیا ہے یہ تکلیف مت کیجے

منا سب ہے یہی بی اے کا پہلا امتحان دیجے

لڑکا :-

کسی کی فنکریں کیوں آ رہے تم کو پسینے ہیں

ابھی تو امتحان میں ٹھیک پونے نو ہینے ہیں

لڑکی :-

بہت رہتی ہے جینم دھاڑ سب بچوں کی اس گھر میں

پڑھے گا خاک کوئی اتنا واویلا ہو جس گھر میں

لڑکا :-

ارے ہر شام کچے باغ میں ہم بیٹھ جائیں گے

اُسکے اُسکے یا طوفاں ہم نہیں انگلش پڑھائیں گے

لڑکی :-

اجی چھوڑو یہ باتیں اپنا دل تم کو کچے ہو گم

کو نا صاف اچھڑے عشق کرنا چاہتے ہو تم

بنت عم

لے کے اپنی اداؤں کے لشکر

وہ دبے پاؤں گھر سے آتی ہے

چاند حیرت سے اُس کو کہتا ہے

سوچتا ہے کدھر یہ جاتی ہے

گلستاں کی حسیں ہواؤں میں

اُس کی ہر اک مراد کھلتی ہے

دن میں کہتی ہے جس کو وہ بھائی

رات کو چپ کے اُس سے ملتی ہے

بھائی ہیں

ان نظموں کے مطالعہ سے ایک ترہی خیال پیدا ہوتا ہے (اور اس کا ذکر تھا) کہ راجہ صاحب محبت میں ہنسی، چٹل، مذاق اور مسرت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ دوسرا احساس یہ مرتب ہوتا ہے کہ وہ خود ہی اس محبت کو مذاق کا نشانہ بھی بنتے ہیں۔ مثلاً "گلوڑا" میں انہوں نے چٹری سکھانے کے بہانے کو مذاق کا نشانہ بنایا ہے۔ اسی طرح "بنتِ عم" میں محبت کی جذباتی سطحیت کو اُجاگر کیا ہے۔ ناظر ان نظموں کے مطالعہ سے تیسرا تاثر یہ قبول کرتا ہے کہ محبت کے سلسلے میں شاعر کے پیش نظر انسانی زندگی کا صرف وہی دور ہے جو آغازِ شباب کا زمانہ ہوتا ہے اور جسے کسی بہتر نقطہ کی عدم موجودگی میں (ADOLESCENCE) کا دور کہنا چاہیے۔ اس دور کی محبت میں ناچنگی، اضطراب، جذباتیت، چٹک اور ہنسی اور مذاق کی فراوانی ہوتی ہے۔ گویا محبت میں "کھلندہ راپن" موجود ہوتا ہے۔ راجہ صاحب محبت کے لاتعداد مختلف پہلوؤں میں سے "کھلندہ راپن" کے پہلو کو اس لئے اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے کہ ایک تو یہ پہلو خود شاعر کی مخصوص اُفتادِ طبع کے عین مطابق ہے۔ دوسرے جس قدر جذباتی اور ناچختہ کوئی کیفیت ہوگی، اتنا ہی مذاق کا نشانہ بھی بنے گی۔ چنانچہ راجہ صاحب آغازِ شباب کی محبت کو اس کی تمام تر ناہمواریوں اور بدحواسیوں کے ساتھ پیش کر کے مزاح کی تخلیق کرتے ہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر قاری کو مسرت بہم پہنچانے میں

کامیاب ہو جاتے ہیں۔

عورت اور مرد کے ربطِ باہم کی ایک صورت تو اٹھتی جوانی کی جذباتی محبت ہے جسے راجہ صاحب نے اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ربط کی دوسری صورت ازدواجی زندگی کا وہ خاص رنگ ہے جو ایک کامیاب جذباتی محبت کا ضروری نتیجہ ہے۔ اس رنگ کو اُجاگر کرنے میں راجہ صاحب نے اس تضاد کو موضوعِ سخن بنایا ہے جو جذباتی محبت کی مادیاتی کیفیات اور ازدواجی زندگی کی خالص ارضی حیثیت میں ہے اور اس طرح خوابوں کی شکست و ریخت کے سارے منظر کو پیش کر دیا ہے۔ اس عمل سے کوئی اہم انگیز کیفیت معرضِ وجود میں نہیں آئی بلکہ انسانی فطرت کی ایک نمایاں غیر ہموازی سطح پر نمودار ہوئی ہے۔ اور اسی لئے یہ ناہمواری تفریحِ طبع کا موجب بنی ہے۔ پھر دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ جب راجہ صاحب ازدواجی زندگی کی نہٹی نہٹی ناہمواریوں کو پیش کرتے ہیں تو قاری کے دل میں شادی کے بعد کی زندگی کے خلافتِ نفرت کا کوئی جذبہ پیدا نہیں کرتے، بلکہ دل چسپ بات یہ ہے کہ عورت اور مرد کے اس طویل ربطِ باہم کو اُجاگر کرتے وقت وہ ہمدردانہ اندازِ نظر کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس طور کہ ازدواجی زندگی کا زمانہ بجائے خود ایک دل چسپ کھیل کی صورت میں نظر آنے لگتا ہے۔ اس ازدواجی زندگی میں عورت اور مرد اپنے جذباتی اور ذہنی بعد کے باعث ایک

دوسرے سے متصادم ہوتے، ایک دوسرے کو ہدف طنز بناتے اور ایک ہنگامی
 نما آسودگی کا مظاہرہ ضرور کرتے ہیں تاہم ایک تو اس سارے کھیل کی نوعیت
 نیم منجیبہ ترک جھونک سے آگے نہیں بڑھتی۔ دوسرے اس کے پس پشت
 شاعر کا ہمدردانہ انداز نظر اسے اطمینان کا روپ اختیار کرنے سے باز رکھتا ہے
 نتیجتاً ازدواجی زندگی کی یہ تمام تصاویر فرحت، انبساط اور آسودگی کے
 مواقع بہم پہنچاتی اور یوں اس رابطہ یا ہم کو زندگی کے ایک نہایت خوشگوار
 دور کی صورت میں پیش کر دیتی ہیں۔ یہ سب کچھ شاعر کی اُفتادِ طبع کے مطابق
 بھی ہے کہ اس کا مسلک زندگی کی مختلف کردوٹوں کے تفصیلِ مسرت کے سوا
 اور کچھ نہیں۔ اس نکتے کے ثبوت میں یہ چند مثالیں قابلِ غور ہیں:-

تو ہے اک ڈاکو کا بیٹا تو نہیں رو میری جاں
 سو جا ہیبتِ خال کے پوتے سو جا چیم دھاڑ خاں
 ایک دن کا ذکر ہے روتی تھی میں سوتی نہ تھی
 باپ تیرا چپ کرانا تھا میں چپ ہوتی نہ تھی
 تھڑ ڈالیں اُس نے ہاک نکتے سے یری پسلیاں

سو جا ہیبتِ خال کے پوتے سو جا چیم دھاڑ خاں
 "جلال زادہ"

کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

اے مری رُو مٹی ہوئی بیوی ذرا منہ سے بول

شک نہ کر مجھ پر مری جان سے پیار کی تہاڑ
 پڑھ رہا تھا کسی مسجد میں تہجد کی نماز
 ایک ہی صفت میں کھڑے تھے وہاں محمود و یار
 نہ کوئی بندہ وہاں تھا نہ کوئی بسندہ نواز
 میرے ہی گھر سے نہ کر ہائے مرا بہتر گول

کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول
 پھول اک روز تر سے پیار کے توڑے میں نے
 کھائے والد سے ترے عشق میں کوڑے میں نے
 مرمی بات تر سے پھر بھی نہ چھوڑے میں نے
 بحرِ سمرال میں دوڑا دئے گھوڑے میں نے

اپنے ماضی کے ترازو میں ذرا مجھ کو تول
 کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

"دھک نیم شب"

(۱)

زمین کے چاند ترا حُسنِ آسمانی ہے
 ہر ایک جلوہ ترا اک نئی کہانی ہے

ہے تیرے جلوں سے رخشہ میری عمر کی رات
 زہے نصیب کہ تو ہو مری شریکِ حیات
 گھر آؤں گا جو سہرہ شام ہو کے میں بے حال
 نہال دل کو کریں گے یہ تیرے پھول سے گل
 گلے میں ہوں گے مرے ہر تیری باہوں کے
 چمک اٹھیں گے تارے تری نگاہوں کے
 خدا کے واسطے کھو لو بھی آ کے دروازہ
 میں کتنی دیر سے باہر کھڑا ہوں چیخ رہا
 اگر علیل نہ ہو آپ کا مزاج شریف
 تو بیکھا بھلے ذرا اکٹھ کے کیجئے تکلیف
 یہ چار پائی مری ٹیڑھی کیوں بچانی ہے
 بھلا اکتی یہ کیوں فرش پر گرانی ہے
 چپائیاں مرے اللہ سب کی سب کچھ
 تمام عمر ہی شاید رہو گی تم بچی —

— ”اس سے اور اسی سے“

بحیثیتِ مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ راجہ ہندی علی خاں کی نظموں میں
 شادی سے قبل اور شادی سے بعد کی زندگی کے ایسے تمام پہلو پیش ہوئے

ہیں جو تاہم اوریوں کو جنم دے کر مسرت و بہجت کے مواقعے بہم پہنچاتے ہیں۔
 اسی طرح انہوں نے اپنی نظموں میں محبت کے خالص ارضی پہلوؤں ہی کو
 زیادہ تر پیش نظر رکھا ہے۔ یہ محبت آدم اور حوا کی سیدھی سادھی اور
 بے لوث محبت ہی کا عکس نہیں بلکہ اس میں روح کی بجائے جسم زیادہ نمایاں
 اور اس کے نتیجے کے طور پر جسم کے صحت مند خون کا رنگ زیادہ روشن ہے
 ان کے کردار محبت کے مادی پہلوؤں سے متاثر اور اس کے ارضی کیفیت سے
 لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مثلاً ان کے پہلے مجموعہ کلام ”مغز اب“ کی بیشتر
 نظموں میں محبت کا جذبہ، رنگیں خطوط، چھڑ چھاڑ اور محبوب کے جسم سے
 مس کی ہوئی اشیاء — انگٹھری، رومال وغیرہ تک محدود ہے اور اس
 مجموعے کے بعد کی نظموں میں چھڑ چھاڑ، نوک جھونک اور غلط فہمی (FLIRTATION)
 کے پہلو زیادہ نمایاں ہیں اور ان کے اس سارے طریق کار میں بچپن کے رجحانات
 منعکس ہیں۔ خود بچہ اپنے قد کے مطابق ارد گرد کے ماحول کو دیکھتا ہے اور
 چونکہ وہ اپنے بڑوں کی یہ نسبت زمین سے زیادہ قریب ہوتا ہے اس
 لئے زندگی اور ماحول کی طرف اس کے رد عمل میں بھی زمین اور گوشت پرست
 سے وابستگی زیادہ ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بچہ
 سب سے بڑا مادہ پرست ہے اور باہر یہ عیش کوش کا سب سے بڑا علم پر دار۔
 بچے کے اس صحت مند رجحان کو اگر بعد کی زندگی میں قائم رکھا جائے تو

جوانی کی محبت کے بارے میں وہی رد عمل ابھرتا ہے، جسے راجہ ہمدی علی خاں نے پیش نظر رکھا ہے اور جس کے نتیجے کے طور پر محبت کا جہانی اور مادی پہلو ابھر کر نمایاں ہو جاتا ہے۔

راجہ ہمدی علی خاں کے ہاں تحصیلِ مسرت کا یہ رجحان آدم اور حوا کی کہانی کے مکمل بیان تک ہی محدود نہیں۔ اس کہانی کے مختلف کرداروں کی مسرتوں اور خوابوں میں شرکت کرنے اور ان کی ناہمواریوں کو مذاق کا نشانہ بنانے کی یہ روش وسیع تر زندگی کی ناہمواریوں تک بھی پھیلی ہوئی نظر آتی ہے جس طرح وہ نوخیز جذباتی محبت کی ناہمواریوں کو گرفت میں لیتے ہیں اور ازدواجی زندگی کی سنجیدہ فضا میں مضحک پہلو تلاش کر لیتے ہیں بالکل اسی طرح وسیع تر زندگی کی بے رنگی، یکسانیت اور سنجیدگی میں بھی انہیں انسانی افعال کے مضحک پہلوئی الفور نظر آ جاتے ہیں۔ زندگی کا ایک عام ناظر عادت اور تکرار کے حصار میں اس بُری طرح قید ہوتا ہے کہ اُسے اشیاء کے نوکیلے کنارے نظر ہی نہیں آتے۔ دوسرے لفظوں میں وہ زندگی کی پامال راہوں میں ایک مشین کی سی سنجیدگی کے ساتھ رواں دواں رہتا ہے اور اُسے کبھی ایک لحظہ کے لئے رُک کر اپنے اور اپنے ساتھیوں کے جذباتی انہماک پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ ایسا شخص نہ تو کبھی ایک اچھا فن کار بن سکتا ہے اور نہ اُسے انسان کے جذباتی تقاضوں

پر ہنسنے کا منصب ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ راجہ ہمدی علی خاں کی نظموں کی اہمیت اس بات میں ہے کہ شاعر نے عام زندگی کے مضحک پہلوؤں کو تلاش کیا ہے اور پھر ان ناہمواریوں کو سطح پر لانے کی کوشش کی ہے۔ اس سے ایک عام ناظر کو لحظہ بھر کے لئے رُک کر اپنے جذباتی انہماک پر ہنسنے کا موقع بھی ملا ہے۔ گویا شاعر نے ناظر کو زندگی کی بے رنگی اور یکسانیت کا احساس دلانے کے لئے اس سب سے بڑے انسانی المیہ پر زور نہیں لگھا بلکہ محض اس کی مضحکہ خیز صورت پر سے پردہ اٹھایا ہے اور ناظر کی محنت انسانی افعال کی ناہمواریوں کا احساس ہونے لگا ہے۔ یہ چند ٹکڑے دیکھئے:-

آئی جو ایک اور بھی آتی چلی گئیں

چھوٹے سے ایک گھر میں سمائی چلی گئیں

بچوں کی فوج کے ہوئیں گھر پر حملہ زلہ

ہم دشمنوں کے ہوش اڑاتی چلی گئیں

غینچہ دہن اُگلتے رہے دودھ بار بار

یہ بار بار دودھ پلاتی چلی گئیں

نٹھوں نے فرشِ پاک پر دریا بہا دئے

دریاؤں میں یہ بسند لگاتی چلی گئیں

بچوں نے پھیرے ناک سے نغے شر شر

ناکیں پکڑ کے "چھوٹے" یہ کراتی چلی گئیں "بیوی کی مہیا"

رضیہ ذرا گرم چادر تو لانا
ذکیہ ذرا ٹھنڈا پانی پلانا
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ
ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ

رنگنا پلاؤ ذرا اور حنا لہ
بڑھانا ذرا تو رے کا پیالہ
جدھر دیکھتے ہیں اُدھر غم ہی غم ہے
کہیں اس کا بھنا بھی ماتم حکم ہے

یہ ننھی کے زردے میں کشمش ہو تھوڑی
بہت دیر سے مانگتی ہے ٹکڑی
وہ ٹکڑا جگر کا تھا آنکھوں کا تارا
ہمیں اپنی اولاد سے بھی تھا پیارا

پڑا ہے پیاد میں گھی ڈال دے کا
خدا تو ہی حافظ ہے میرے گلے کا
دلہن سے کہو آہ اتنی نہ روئے
بے چارہ نہ بے کار میں جان کھوئے

اری بوٹیاں تین سالن میں تیرے
یہ چھپڑا کھٹا تھا مقدر میں میرے
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ
ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ

————— "ایک چہلم"

گتا کیوں ابی دُم دباتا ہے؟
کتنے میں ایک بندر آتا ہے؟
تھوڑی پور میں کتنے مانی ہیں؟
شہر میں کئے مکان خالی ہیں؟

آج کیا بھاؤ ہے بتائے گا؟
کیٹس کا دزن کتنے ماشے تھا؟
لانگ فیلو کی کتنی ٹانگیں تھیں؟
صبح مرغے نے کتنی بانگیں دیں؟
اُردو ناول میں کیا جھکاؤ ہے؟
کیوں نہی شاعری میں تاؤ ہے؟
————— "بورڈ آف انٹرویو"

لہنا سنگھا کلمہ پڑھا!

لالہ — آگے بڑھا!

آگے آپ بتا دیجے،

میری جان بچا لیجے،

آگے مجھے اگر آتا

تم سے میں کیوں پڑھواتا

سبوج نہ اب بے کار رحیم!

مار اس کو تلوار رحیم!

دُور ہوں اس کے سب کھڑے

کہوے اس کے دو ٹکڑے

————— "پارٹیشن"

ان نظموں کے مطالعہ سے محض یہی تاثر مرتب نہیں ہوتا کہ راجہ
نہدی علی خاں زندگی کے رُخ روشن کے خوشگوار لیکن مضحک پہلوؤں

کو پیش کر کے سرت و صحت کی ایک نضا قائم کر لیتے ہیں، بلکہ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی الٹانگ حقیقتوں کے مضحک پہلوؤں تک رسائی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہیں۔ "ایک چیم" کے سلسلے میں انھوں نے دُولہا کی الٹانگ موت کے پس منظر پر انسان کی ریابکاری، تصنع اور دنیا داری کے نقوش کو اس طرح اجاگر کیا ہے کہ ناظر اس "ٹریجڈی" سے متاثر ہونے کی بجائے "طرزِ پاک اہل دنیاہ کو دیکھ کر ہنسنے لگتا ہے۔ اسی طرح "پارٹیشن" میں انھوں نے مذہبی جنون کے مضحک پہلو کو اس طور پر پیش کیا ہے کہ قتل، اکارب انگیز پہلو دب کر رہ گیا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے ملک کی پارٹیشن کو جسم کی پارٹیشن ذکر دے اس کے دو ٹوک سے تشبیہ دے کر فن کا ایک لطیف نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ فطرت کی طرف سے بعض لوگ سرت کی تقسیم پر مامور ہوتے ہیں اور وہ زندگی بھر روتی بسورتی ہوئی خلقت کے آنسو پونچھنے اور اسے ہنسانے کے مبارک کام میں مصروف رہتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات وہ غم سے بھی اہل دنیا کے لئے تفریح کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتے ہیں۔ صاحبِ ہندی علی خاں کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا چاہیے۔

راجہ ہندی علی خاں "حال" کے شاعر ہیں۔ اور اسی لئے ان کی نظموں میں گوشت پوست کی زندگی سے ایک گہری وابستگی کے شواہد ملتے ہیں۔ ان کے ہاں اس زندگی اور اس کے ارضی پہلوؤں سے لطیف انداز ہونے کا رجحان اس قدر توانا ہے کہ انھوں نے محبت، ازدواجی رفاقت اور وسیع تر زندگی

کی ناہمواریوں ہی سے خطا اٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہر اس خیال کا مذاق بھی اڑایا ہے جو گوشت پوست کی اس زندگی اور اس کی بے بہا سرتوں سے انسان کی نظریں ہٹا کر کسی خیالی جنت کی طرف مبذول کرتا ہے۔ چنانچہ ان کی نظموں کا ایک بہت بڑا حصہ جنت اور اس کی فضائے متعلق ہے۔ وہ جب جنت کی ارفع اور پاکیزہ نضائیں سرت کی خالص ارضی کیفیت کو پیش کرتے ہیں تو سارا ماحول مضحکہ خیز نظر آنے لگتا ہے۔ صاحب نے اس ناہمواری سے بددھم اُتم فائدہ اٹھایا ہے اور جنت کے ابدی روحانی کیفیت کو خالص ارضی سرت کی سطح پر لا کر ایک دل چسپ مزاحیہ تقابل کو جنم دیا ہے۔ ان نظموں کے مطالعہ سے شاعر کا اندازِ نظر بھی واضح ہوتا ہے۔ وہ مستقبل کی ابدی سرت کو نشانہ طرز بنا کر گریا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سرت کی نوعیت عارضی اور ہنگامی ہے اور اسی لئے اس کا بہت گہرا تعلق زمین سے ہے نہ کہ آسمان سے۔ دوسرے لفظوں میں وہ مستقبل کے ابدی کیفیت پر حال کی عارضی سرت کو ترجیح دیتے ہیں اور یہی ان کا مطمح نظر ہے۔ جنت کے بارے میں لکھی گئی ان نظموں سے صاحب کا وہ ردِ عمل بھی واضح ہوتا ہے جو محبت، ازدواجی رفاقت اور وسیع تر زندگی کی ناہمواریوں کے پیش نظر پیدا ہوا تھا، یہ ردِ عمل ایک خوش باش صحت مند اور کھنڈے سے اڑنے کے کامدہ عمل ہے۔ اور یہ اڑنا زندگی کی سرتوں میں حریک ہونے کے لئے جیتا ہے۔ چنانچہ صاحب نے ہندی علی خاں کی جنت

دراصل اسکول سے باہر کی وہ دنیا ہے جس تک وہ اور اس کا ہم راہو۔
شیطان پہنچنا چاہتے ہیں۔ پس جب وہ جنت کی دیوار پر چڑھ کر جنت کے
اندر کی دنیا پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو دراصل اسکول کی دیوار پر سے باہر
کی دنیا کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ فی الواقعہ جنت کے مظاہر کی طرف ان کا
سارا ذہن ایک شریک لڑکے کا بندھل ہے اور اسی لئے انہیں جنت کے
بظاہر سنجیدہ واقعات اور کرداروں کے بعض سنجیدہ اعمال میں مضحک پہلو
فی الفور نظر آجاتے ہیں یہ ایک مثال قابل غور ہے:-

جنت کی دیوار پہ چڑھ کر میں اور شیطان دیکھ رہے تھے
جو نہ کبھی ہم نے دیکھا تھا ہو کہ حیراں دیکھ رہے تھے

وادی جنت کے باغوں میں اُت تو بہ اک حشر بیا تھا
شیطان کے ہونٹوں پہ ہنسی تھی ہیرا کلیجہ کانپ رہا تھا

میں نہ کبھی بھولوں گا تو بہ میں نے دیکھا جو نظارہ
”لعنت! لعنت! بول رہا تھا جنت کا ہر منظر پیارا

موٹی موٹی تو ندوں والے بد صورت بد مزیت ملا

خود زدہ خودوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے کہہ کے ”ہا ہا“

”یس اور شیطان دیکھ رہے تھے“

اس کے مقابلے میں جہنم یعنی اسکول کے اندر کا نقشہ دیکھئے جہاں
سے ایک ”شریک لڑکے“ کے باہر نکال دئے جانے کا سارا منظر آنکھوں کے
سامنے آجاتا ہے۔

خشتوں نے جب مجھ کو درخ میں بھینکا دُسا مجھ کو اک سانپ نے پہلے اک
پھر اک کانے پھونے ”چٹکی میرے لی پھر اک بھڑنے کا ٹانجھے مسکرا کر
جہنم کے ہلکے ہوئے بایوں نے مجھے دیکھ کر تھمتے خوب مارے
چڑیلوں کے دادا یہ بھگتوں کے تانا لگے کہنے ”کیسی طبیعت ہے پیارے“
بھویں تن گئیں ریری غصے کے مارے کیا میری فطرت نے مجھ کو اشارا
جہنم کے ایک ایک باسی کو میں نے وہیں پر پکھاڑا وہیں خوب مارا
اکھائی وہاں میں نے ایسی قیامت جہنم کے باسی جہنم سے بھاگے
میں لوہے کی لٹھ لے کے تھا پیچھے پیچھے وہ اکھڑے قدم لے کے تھے اگے اگے
گئیں ٹوٹ اُن نامرادوں کی مکر میں بہت اُن کی آنکھوں نے آنسو بہائے
ہراک کہہ رہا تھا ”بچاؤ بچاؤ“ اسے مر گئے مر گئے ہائے ہائے
جہنم کے لوگوں کی دیکھی یہ حالت توشاب کی لمبی کو رحم اُن پہ آیا
نکالو نکالو ”اسے“ جسد باہرا یہ کہہ کر جہنم سے مجھ کو بھگایا

پلو یار منو چلو کر شہنشاہ چنڈرا ! یہ کہہ کر وہاں سے ہوا میں روانہ
 ہمیں دور سے کہہ رہا تھا اشائے برہم شام جنت کا موسم کہانا
 ”جہنم میں غنڈے“

راجہ ہمدی علی خاں نے جنت کا مذاق اڑا کر ہمیں اپنے تصورات ،
 عقائد اور نظریات پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے کی تحریک بھی دی ہے۔ بالعموم
 عقیدہ ، تنقید اور تحریک کا متعلق نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح نظریات اور تصورات
 کے سلسلے میں بھی آنکھیں بند کر کے ایک سیدھی پامال لکیر پر بڑھے چلے جانے
 کا رجحان عام ہے۔ راجہ صاحب نے اپنی نظموں میں عقائد اور نظریات کے
 مضحک پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ”دعا“ ”شیطان“ ”اشنان“
 ”مریدان با صفا“ وغیرہ نظموں میں ان کا یہ طریق کار بہت نمایاں ہے۔ اس
 سے جذباتی تشبیح کی کیفیت مدہم اور مرعیانہ سنجیدگی کا دباؤ کم ہوا ہے اور
 اس تشبیح اور دباؤ کے ہٹ جانے سے قاری کو ایک عجیب طرح کی فرحت
 نصیب ہوتی ہے۔ ماحول ، زندگی اور عقیدے کو ایک نئے زاویے سے
 دیکھنے کا یہ رجحان آخر آخر میں ایک انوکھے روپ میں نمودار ہوا ہے۔ اس
 سلسلے میں یہ دو نظمیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں :-

دیران تھا صحرا خاموش تھا دریا
 دریا کے کنارے سردی سے بھڑکتا

اک اور دھکے لڑی چپ چاپ تھا بیٹھا
 کرسی کی لئے ٹیک
 کالا سا ہار ایک

”گلاہ پوش“

اس پر بہت ہنسناؤں میں
 میرے خدا سُن تو ذرا
 یہ آسمان کا بلبلبہ
 کیوں تو نے ہم پر رکھ دیا

”آسمان کا بلبلبہ“

یہ نظمیں اس بات پر وال ہیں کہ راجہ صاحب اپنے مخصوص زاویہ نگاہ کے
 تحت جب زندگی کے بے جان مظاہر اور کائنات کی پراسرار وسعت پر ایک
 نظر ڈالتے ہیں تو انہیں ساری دنیا ہی بے ڈھب اور مضحکہ خیز نظر آنے لگتی
 ہے۔ اور وہ اُس کے ”بے ڈھنگے پن“ کا تصور کر کے بے اختیار مسکراتے لگتے
 ہیں۔ اس سے قاری کا جذباتی انہماگ کم ہوتا ہے اور وہ بھی شاعر کے ادیبانہ نگاہ
 کو اپنا کر بے جان مظاہر کی مضحکہ خیز صورتوں سے لطفت اندوز ہونے لگتا ہے۔
 مسرت بہم پہنچانے کا یہ انوکھا نماز راجہ ہمدی علی خاں سے خاص ہے اور اس
 خاص میدان میں ان کی حیثیت یقیناً منفرد اور یکتا ہے۔ وزیر آغا

میری نظموں کا دوست

(۱)

میں نے اپنے حلقے پر بہت زور دیا ہے۔ بہت دور دور تک
نظریں دوڑادی ہیں تعجب ہے کہ اس وسیع و عریض دنیا میں مجھے اپنا
کوئی دوست، کوئی ہم خیال، کوئی خیر خواہ نظر نہیں آیا۔ کوئی کتاب، بلی، تمک
مجھ سے ملنقت نہیں۔ پناہ بخدا!

لیکن میری نظموں کا کم از کم ایک دوست اس دنیا میں ضرور ہے۔ شاید
اسی وجہ سے مجھے اپنی نظموں سے جلن سی ہوگئی ہے۔ یہ مجھے ایک آنکھ نہیں
بھاتیں۔ اور میری دوسری آنکھ شاید ہے ہی نہیں۔ البتہ اپنی تیسری آنکھ
سے میں نے اس دنیا پر جتنا اچھٹی ہوئی نگاہیں ضرور ڈالی ہیں اور بقدرِ ظرف
جو کچھ دیکھ سکا یا محسوس کر سکا، اُسے اکثر تانیے اور ردیف کے ساتھ اور
کبھی کبھی اس کے بغیر بھی لکھ دیا ہے۔

میں اپنی "نظموں کے دوست" سے کبھی نہیں ملا۔ وہ یہاں سے بہت
دور سرحد پار رہتا ہے۔ اپنی نظموں کے علاوہ میں اُس سے بھی جلتا ہوں،
شاید اس لئے کہ وہ بھی ایک شاعر ہے۔ صرف شاعر ہونا کوئی اتنی بری بات
نہ تھی، لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ مجھ سے بہتر شاعر ہے بات برداشت کرنے
کی نہیں ہے۔ تاہم بادلِ ناخواستہ میں شاید اسے بھی رودھو کر برداشت
کر لیتا لیکن جب اُس کے نظموں سے یہ حقیقت کسی عدالتِ عالیہ کے
مستفانہ فیصلے کی طرح مجھ پر ثابت ہوگئی کہ وہ مجھ سے بہتر انسان بھی ہے
تو معاملہ حد ضبط سے باہر ہوگیا۔ اپنی "نظموں کے دوست" کا یہ قصور
میں کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ اُس کے کیریکٹر کا اندازہ لگانے کے لئے
صرف اتنی سی بات لکھ دینا کافی ہوگی۔ کہ وہ کسی بُری چیز کو "بُرا" کہنے کی بجائے
مگر اچھا کہتا ہے۔ ظالم!

کتے ہوئے جی جانتا ہے لیکن حقیقت ہے کہ "میری نظموں کا دوست"
ایک عظیم الشان نقاد ہے۔ ایک اعلیٰ پائے کا ادیب ہے اور شاعر ایسا
کہ دیکھ کر رشک ہو، پڑھ کر چی جلیے۔ شاعری کے ساتھ مصوری بھی کر
جاتا ہے تاکہ آرٹ کی اس صنف میں بھی کسی دوسرے کے لئے جگہ نہ رہے۔
مصور تو سات جانے پہچانے رنگوں کی آمیزش سے تصویریں بناتے ہیں۔
یہ ان گنت رنگوں کی آمیزش سے اپنی نظموں کے پس منظر میں اور کبھی کبھی

لفظ لفظ کے پیچھے ایسی رنگارنگ تصویریں بنادیتا ہے کہ پڑھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں کہ وہ ان تصویروں کو دیکھیں یا ان نظموں کو پڑھیں، اس طرح اپنے شیدا یٹوں کے لئے وہ باعث "مہیبت" بنا ہوا ہے۔ اور اب تو اس ظالم نے افسانے بھی لکھنے شروع کر دیے ہیں اور افسانے بھی ایسے کہ مجھ جیسا آدمی پر مجبور ہو جائے کہ

"وہ فتنے" آدمی کی "خانہ ویرانی کو کیا کم تھے؟"

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، اپنی نظموں کے دوست سے میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ البتہ ان خطوں میں وہ اکثر مجھے دکھائی دیا ہے جو میرے خطوں کے جواب میں مجھے اکثر اس کی طرف سے موصول ہوتے رہے ہیں۔ انہی خطوں میں میں نے اُسے پڑھا بھی ہے مگر ہے وہ آپ کو ایسا دکھائی نہ دے جیسا کہ میں نے اُسے دیکھا ہے یا پایا ہے۔ لیکن آپ تو اُسے دونوں آنکھوں سے دیکھتے رہے ہوں گے۔ تیسری آنکھ سے آپ نے نہیں دیکھا ہوگا۔

اُس کی شاعری کی دنیا میں میری اکثر اُس سے ملاقات ہوئی ہے۔ اپنی دنیا کے تصور میں بھی میں نے بار بار اُسے دیکھا ہے۔ چاندنی راتوں میں پُر اسرار دشت پیمائی کرتے۔ گر جتے بادلوں کے نیچے بڑبڑاتے۔ جنگل میں بوڑھے درختوں سے دوستی کرتے۔ کھنڈروں میں آدھی رات کو ہواؤں

میں اپنے خیالات کے دئے جلاتے، اُداس وادلوں میں تنہائیوں سے لڑتے جھگڑتے، سر بہ خیم آبشاروں کو اور بھی زیادہ خاکساری کی خاموش تھمتیں کرتے توں قرح کے پُل پر چڑھتے اور اُترتے۔ ہر طرف کی ٹوپیاں اوڑھے ہوئے "جیشی پہاڑوں" سے تبادلہ خیالات کرتے، ہنسنان میں خوبصورت تیلیوں کو ٹوکتے۔

وہ ہماری دنیا سے بہت دُور اپنی دنیا میں رہتا ہے۔ اسے جنگلوں اور دیرانوں سے بہت محبت ہے۔ وہ جنگل میں کسی ندی کے کنارے یا کسی چٹنے پر یا کسی بارش بوڑھے برگہ کے تلے عینہ کر دینا دما فیہا کو بھول جاتا ہے۔ جنگل کے پرند اُسے بے آزار سمجھ کر اس کے سامنے کسی پیر پر کُبیٹھے ہیں۔ اُسے حیرت سے دیکھتے ہیں۔ اس پر رحم کھاتے ہیں اُسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں، جب وہ کسی طرح ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو وہ مارے غصے کے بطور گالی اُسے "خاموش کہیں کا" کہہ کر سرت کی تلاش میں کہیں دُور اُڑ جاتے ہیں۔ سفید خرگوش دبے پاؤں اُس کے قریب آتے ہیں۔ شاعری کے بارے میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں قریب آکر "فون فون" کی آوازیں لگاتے ہیں۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہتا ہے تو وہ اُس کا مُنہ چڑا کر "سرپٹ" بھاگ جاتے ہیں۔ جنگل کے ہرن اپنے دوستوں کو اکٹھا کر کے پتوں اور ڈالہوں کی ادھ سے کر اُس کے

قریب آجاتے ہیں اور اشارے ہی اشارے میں ایک دوسرے کو بتاتے ہیں۔ دیکھو! وہ بیٹھا ہے! وہ!!

اپنی "نظموں کے دوست" سے میری خط و کتابت ہمیشہ "کام کی باتوں" تک محدود رہی ہے۔ جب بھی میں نے اُسے ان حدود سے باہر لانا چاہا مجھے ناکامی ہوئی، خطوں میں ہزاروں کہ وڑوں باتوں کا جواب نہایت صفائی سے گول کر جانا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ اُس کے بارے میں اگر کوئی بات معلوم کرتی ہے تو اُس سے نہیں پوچھتے اس کے لئے انہیں اُس کے پڑوسیوں سے خط و کتابت کرنی پڑتی ہے۔

اس ایک سال کے عرصے میں اُس کے بارے میں مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ صبح ناشتہ کرتا ہے، دوپہر کو کھانا کھاتا ہے، چار بجے چائے پیتا ہے اور رات کو کھانا کھا کر سو جاتا ہے۔ بیٹے میں ایک بار ایڈیٹر "ادبی دنیا" سے ملنے اپنا شہر چھوڑ کر لاہور جاتا ہے۔ اُن سے کوئی بات کرتا ہے یا بغیر بات کئے واپس آ جاتا ہے۔ یہ بات ابھی تک مجھے معلوم نہیں ہو سکی، اُنکی شام کی گاڑی سے واپس آ جاتا ہے۔ شہر میں کسی سے بات نہیں کرتا۔ اپنے ساتھ ایک ملازم رکھتا ہے۔ اگر کوئی اُسے سلام کرے تو نوکر اس کی طرف سے سلام کا جواب دے دیتا ہے۔ اگر کوئی اس بات پر حیرت زدہ ہو تو نوکر اُسے بتا دیتا ہے کہ "صاحب ذرا بات چیت کم کرتے ہیں۔ مجھے انھوں نے

اسی کام کے لئے نوکر رکھا ہے۔"

لاہور سے بہت دور وہ اپنے شہر کے زواح میں "شور و شر سے چھپ کر رہتا ہے۔ لیکن اینٹ پتھر کے مکان میں نہیں بلکہ تنہا اور تنہائی کی اونچی اونچی دیواریں اُس نے اپنے ارد گرد کھڑی کر رکھی ہیں۔ ان پر ازلی اور ابدی خاموشی کی چھت ہے۔ انگن میں بے خودی کے پھول کھلے ہیں۔ دیواروں پر جگہ جگہ نہ دکھائی دینے والی تصویریں آویزاں ہیں۔ ڈرائنگ روم میں فلسفہ اُس کا زینچر بن گیا ہے۔ گھر میں اس کے چاروں طرف جگہ جگہ طاق ہائے نسیاں ہیں۔ جہاں ہر وقت عجیب و غریب روشنیوں کے چراغ جلتے رہتے ہیں۔

آپ کچھ بھی کہیں مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ سال میں صرف ایک اُدھ مرتبہ وہ بات کرتا ہے۔ جب خزاں آگیا اُس سے پوچھتی ہے "میں جاؤں؟" تو وہ اثبات میں سر ہلا دیتا ہے۔ پھر بہار اپنی کسمی ادائیں گھسیٹتی بڑے ادب سے اُس کے پاس آکر سلام کرتی ہے اور کہتی ہے "میں آؤں؟" تو وہ جواب میں مسکرا کر ہوا کا اشارہ کر دیتا ہے۔ عموماً سال میں اس کی یہ پہلی یا دوسری مسکراہٹ ہوتی ہے، اس کے بعد کوہ و بیاباں، دشت و جبل اور تین پھولوں سے بھر جاتے ہیں۔ کم از کم میں نے اسے یوں ہی دیکھا ہے۔ جس شخص سے آپ ملتے رہے ہیں۔ وہ اسی نام کا کوئی اور ہو گا۔

ایک مرتبہ اپنی "نظموں کے دوست" سے ملاقات کا شوق حد سے بڑھ گیا، تو چونکہ میری صحت پاکستان کا لمبا سفر کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی، میں نے خطوں میں وقتاً فوقتاً اس کا مزید تعارت کرنا چاہا۔ آخری خط میں مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ نظم نگاری اور ادب نویسی کے علاوہ آپ کا شریفانہ شغل کون سا ہے؟ اللہ کی قسم خط کی ان تمام باتوں کا جواب تو تھا جو میری نظموں کے بارے میں تھیں، لیکن اس سوال کا جواب بالکل غائب تھا۔ میں بھی یہ سمجھ کر خاموش ہو گیا کہ "میری نظموں کا دوست" شاید کوئیں کی خفیہ تجارت کرتا ہوگا یا بردہ فروش ہوگا۔ کسی کے خفیہ بازار پوچھ کر اُسے شرمندہ نہیں کرتا چاہیے۔ یہ ہے "میری نظموں کے دوست" کی مختصر ترین کہانی۔

(۲)

آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں اپنے متعلق یا اپنی نظموں کے متعلق کچھ کم لکھ رہا ہوں اور اپنی "نظموں کے دوست" کے متعلق زیادہ۔ ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ اس وقت آپ میری جو نظمیں پڑھنے والے ہیں یا پڑھ رہے ہیں ان کا مصنف بھی میری "نظموں کا دوست" ہی ہے۔

میں نے اپنے ایک خط میں محض تفریحاً بڑی غیر سنجیدگی سے اپنی چند

نظمیں مولانا صلاح الدین احمد صاحب کو بھیجی تھیں اور لکھا تھا "بڑھ کر چاک کر دیجئے۔ لیکن میری یہ نظمیں شاید مولانا صلاح الدین نے "میری نظموں کے دوست" کو بھیج دیں اور اس کے بعد یہ سب گزرتا ہوا شروع ہو گئی۔

میں نے اپنے اس خط میں "اپنی نظموں کے دوست" کا بھی ذکر کیا تھا اور ان سے پوچھا تھا کہ "وہ کون ہے؟ اس کا نام بڑا دلچسپ ہے۔ کیا وہ کوئی ایرانی ہے؟ مجھے اس کا نام ہانٹ کر رہا ہے۔ میں اس شخص سے خط و کتابت کرنا چاہتا ہوں۔ اس زمانے میں میں اپنی نظموں کے دوست سے ناواقف تھا۔ اور اس کی ایک بھی نظم ادب کی دنیا سے لاکھوں میل دور ہونے کی وجہ سے اب تک میری نظموں سے نہیں گذری تھی۔

ایک دن بیکایک میرے نام میری "نظموں کے دوست" کا خط آگیا۔ جس میں اُس نے میری نظموں کی مبالغہ آمیز انداز میں بہت تعریف کی تھی۔ اگر مجھے اپنی نظموں کے دوست کی طرف سے یہ مبالغہ آمیز داد نہ ملتی اور مجھ پر اور لکھنے کے لئے زور نہ دیا جاتا تو مجھے کبھی معلوم نہ ہوتا کہ مجھے بھی لکھنا چاہیے۔ مطلب یہ کہ نظمیں میں نے نہیں لکھیں "بزورِ شمشیر" مجھ سے لکھوائی گئی ہیں۔ اسی لئے میں اپنے موجودہ دور کی تمام نظموں کو اسی شاعر کی تخلیق سمجھتا ہوں۔ البتہ یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آسکی اور صدیوں تک نہیں آئے گی کہ تمارت اور سنجیدگی کے اس پہاڑ کو میری غیر سنجیدہ اور غیر شریفانہ نظمیں کیوں پسند ہیں۔

میری نظموں کو مجھ سے کی صورت دینے کا ذمہ بھی میری نظموں کا دوست ہے۔
 میں نے بہت سمجھایا تھا کہ ان نظموں کو مجھ سے کی صورت دے کہ ہلک کی دل آزاری
 نہ کی جائے۔ لیکن وہاں کون سنتا تھا، خطوں میں جسے چھوڑا بجائی بنایا تھا، وہ اپنی
 سنجیدگی اور متانت کا رعب ڈال کر "بڑا بجائی" بن چکا تھا۔ لاکھ سمجھایا کہ دیکھو رعب
 ڈال کر "بڑا بجائی" بننے کی کوشش مت کرو۔ لیکن اس پٹھان کے سامنے اس اچوت
 کو ہار مانتی پڑی۔ راجپوتوں میں یہ بڑی کمزوری ہے کہ طاقت درادر بہادر ہونے کے
 باوجود آخر میں بیمار سے ہار جاتے ہیں۔ اب میری یہ حالت ہے کہ میں اس عالم بوش حواس
 میں صرف دو ہی "ہستیوں" سے خائف ہوں، آسمان کے خدا سے اور زمین کے
 اس پٹھان سے۔

اگر ان نظموں کو پڑھ کر خدا نخواستہ آپ مجھے داد دینا چاہیں تو اس داد کا مستحق
 بھی میری نظموں کا دوست ہے۔ اگر آپ مجھ پر سیداد کرنا چاہیں تو اس کی مستحق بھی
 یہی پُر اسرار ہستی ہے۔ اگر آپ بیکار ہیں، آپ کو اور کوئی کام نہیں تو ذرا
 اُسی شہر کا رخ کیجئے جہاں میری نظموں کا دوست "چھپ کر رہتا ہے"۔ آپ اُسی
 کے مکان کے سامنے احتجاجی مظاہرے کیجئے اس کے خلاف مشاعرے برپا
 کیجئے، بغیر قافیوں کے نظمیں یا غزلیں لکھئے، قانونی یا غیر قانونی چارہ جوئی کیجئے جیسا
 بھی آپ کا ٹوڈ ہو۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

اگر کسی صاحب کو مجھ سے اس قیمت میں ہنگامہ معلوم ہو جو انھوں نے اس

کے خریدنے پر صرف کی ہے تو دام واپس کرنے کی ذمہ داری البتہ میں اپنے
 سر لیتا ہوں، یہ رقم آپ کبھی بھی لمبی میرے غریب خانے پر تشریف لا کر واپس
 طلب کر سکتے ہیں، لیکن یہ شرط صرف پاکستانی کریم فراؤں کے لئے ہے۔ ہندوستان
 والے مجھ پر بگڑنے کی بجائے پاکستان جا کر میری نظموں کے دوست پر فوجداری
 کریں۔

اگر آپ اس کتاب کی قیمت واپس لینے کے لئے کسی وجہ سے لمبی تشریف
 نہ لاسکیں تو صبر کیجئے۔ اس کا اجراء کو آخرت میں ملے گا۔ لیکن اگر خدا نے آپ
 کو صبر کی دولت سے مالا مال نہیں کیا۔ اور آپ مغلظات پر اُتر آنا چاہتے ہیں
 اور یہ مغلظات آپ مجھے تک پہنچائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تو جس طرح شرفاء
 ہر قسم کی خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ بھی درج کر دیا کرتے ہیں۔ میں نے بھی
 ایک شریف آدمی کی طرح ترسیل مغلظات کے لئے اپنا پورا پتہ نیچے درج کر
 دیا ہے۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، میری نظموں کا اس دنیا میں صرف
 ایک دوست ہے۔ میری نظموں کو ایسا دوست کبھی نہیں ملے گا، حقیقت ہے کہ
 یہ نظمیں میں نے اُسی کے لئے لکھی ہیں۔ جب اُس سے میرے تعلقات ختم ہو
 جائیں گے تو نظموں کا یہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ میری نظموں کی زندگی اور
 موت اُسی کے ہاتھ میں ہے۔

طفل تسلیاں

جی چاہتا ہے کہ پاکستان جا کر اپنی نظموں کے اس دوست سے کبھی
ملوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جو نہی میں اُس کے مکان پر جا کر دستک دوں گا
یا اندر اپنا دزیٹنگ کارڈ بھجوں گا وہ اپنے مکان کی پچھلی دیوار میں جلدی سے
نقہ لگا کر کہیں جنگلوں میں بھاگ جائے گا۔

اچھا ہے کہ یہیں بیٹھ کر ہر روز اُس کے خط کا انتظار کیا کروں، جو
میری تاریک اور خاموش زندگی میں کبھی کبھی باغِ جنت کے چاند کی طرح طلوع
ہو کر مجھے ابدی مسرتوں کے طوفان میں بہا لے جاتا ہے۔

راجہ مہدی علی خاں

۲۵ جنوری ۱۹۶۱ء

۱۴۹۔ پالی روڈ۔ باندہ۔ بمبئی ۵۰۔ بھارت

چور کی دعا

اے خالق ہر ارض و سما وقت دعا ہے
 بندے پر ترے آج عجب وقت پڑا ہے
 پہلے بھی ہر آفت سے مجھے تو نے بچایا
 دائم رہا مجھ پر تیرے الطاف کا سایا
 جب نام ترا لے کے کوئی نقب لگائی
 ہر کام کی تدبیر مجھے تو نے تجبائی
 سچ تو یہ ہے کُتوں کو سلا رکھتا ہے تو ہی
 میرے لئے دروازہ کھلا رکھتا ہے تو ہی
 انصاف کے سچے مجھے تو نے چھڑایا
 اور دامِ حوالات میں اوروں کو پھنسایا

دل میں بہت ارمان لئے نکلا ہوں گھر سے

ایسا نہ ہونا کام میں لوگوں تیرے در سے

نامی کوئی ڈاکو نہیں چھوٹا سا ہوں اک چور

رحم آتا ہے بندوں پہ۔ بہت دل کا ہوں کمزور

مجھ سے کبھی گاڈ ریج کے تالے نہیں ٹوٹے

تیری ہی قسم میں نے کبھی بنک نہ ٹوٹے

چھ سات سو مل جائے تو بندے کو ہے کافی

وہ چور نہیں ہوں جو کرے وعدہ خلافی

اس چھت پہ کند اپنی میں جینکوں کا گھما کر

ہمت دے مجھے اتنی کہ پڑھ جاؤں میں فرز

بسم اللہ! ارے واہ میں قربان! میں قربان

کیا خوب لگی ہے کند! اللہ تیری شان



خروشوں کی غزل

کوئی شکاری بار بار بن میں ہمارے آئے کیوں؟
 چونکیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ڈرائے کیوں؟
 گھر نہیں، جھونپڑی نہیں، کٹیا نہیں، مکان نہیں؟
 بیٹھے ہیں جنگلوں میں ہم کوئی ہمیں جگائے کیوں؟
 کان کھڑے نہ کیوں کریں گھاس میں کیوں ہم چھپیں
 کھٹکا ذرا بھی ہوا اگر کوئی ٹھٹکا نہ جائے کیوں؟
 بن میں ہمارے جو بھی آئے، میرے سے وہ کرے
 آئے ہزار بار خود، کتوں کو ساتھ لائے کیوں؟
 امی سے مار کھا کے بھی خوش کوئی کس طرح رہے
 پانی مزے سے کیوں پیئے گھاس مزے سے کھائے کیوں؟

کتا کتا اک شکاری یہ آئیں گے ہم ضرور یاں

جس کو ہو اپنی جاں عزیز بن میں وہ گھرنائے کیوں؟

چڑیاں نہ چھپائیں کل، سوئیں گے ہم دو بہر تک

بند ہے بن کا دروازہ کوئی ہمیں جگائے کیوں؟



چار بجے

بیٹھے بیٹھے، گھڑی گھڑی مار گئی، چار بجے

میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی، چار بجے

”اٹھو، گھڑی سب تدریس کچھ نہ ”دعا“ نے کام کیا“

امی اور ابا نے مل کر میرا کام تمام کیا“

آج محلے بھر میں گونجی میری دُہائی، چار بجے

میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی، چار بجے

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے تختاری کی

کتنی خوشی سے ہم نے اپنے پٹنے کی تیاری کی

سارے گھر میں ہم نے کیسی دھوم مچائی، چار بجے

میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی، چار بجے

بی ہمسائی تو کیوں آئی تجھ کو شاید علم نہیں

یہ میرے پٹنے کا منظر ہے، کوئی اچھی فلم نہیں

تو برا یہ بیٹنی شو، کیوں دیکھتے آئی چار بجے

میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی، چار بجے

چائے کی میز پر میں نے کچھ کچھ نقص نکالے فوڈ میں تھے

ہائے ری قسمت امی ابا دونوں ہی کچھ فوڈ میں تھے

بیٹھے بیٹھے اُن کو سوجھی میری بھلائی، چار بجے

میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی، چار بجے

تیرے حکم بتائے داتا پتہ تک نہیں ہٹتا ہے

میں تو جانوں تیرے ہی درے مجھ کو سب کچھ ملتا ہے

تھینک یو، تھینک یو، تو نے کرائی میری ٹھکانی چار بجے

میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی، چار بجے



بچوں کی توبہ

ہم نے بکری کے بچوں کو کمروں میں سچا نا چھوڑ دیا
 ناراض نہ ہو امی، ہم نے، ہر شوق پر انا چھوڑ دیا
 ڈیڈی کے سوٹ پہن کر ہم صوفوں پر ڈانس نہیں کرتے
 سارے گھر کی بنیادوں کو اب ہم نے ہلانا چھوڑ دیا
 دادا ابا کا اب چشمہ بکریے کو نہیں پہناتے ہم
 انا ابا کی لٹھیا کو اب ہم نے چھپنا چھوڑ دیا
 بندر کو سہرا بانہ کے ہم دوٹھانہ بنائیں گے امی
 اب گھونگٹ کا رُھ بن ریا کو ڈولی میں بٹھانا چھوڑ دیا
 ندیا کے گھرے پانی میں کھائے نہ کئی دن سے غوطے
 گھر ہی میں پڑے اب نہرتے ہیں نہ یا یہ نہانا چھوڑ دیا
 اب صبر کے پیٹھے پیٹھے پھیل آہیں بھر بھر کر کھاتے ہیں
 مالن کو بنا بیٹھے خالہ، مالی کو رُلانا چھوڑ دیا،

گھر میں بیٹھے سادھویں کر اب علم کی مالا جھپتے ہیں
 خرگوشوں کے پیچھے جنگل میں کتوں کو بھگانا چھوڑ دیا
 بچروں میں بند جو مٹی تھیں وہ پھر سے اڑا دیں سب چڑیاں
 مرغوں میں صلح کرتے ہیں، مرغوں کو لڑانا چھوڑ دیا
 اب ہم نے کبھی کھانا کھا کر کپڑوں سے ہاتھ نہیں پونچھے
 دیکھو کئی دن سے دھوبی نے رونا چلا نا چھوڑ دیا
 ہر ایک بغاوت چھوڑی ہے ہر ایک شرارت خست ہے
 اب گھر میں فرشتے آتے ہیں شیطان نے انا چھوڑ دیا
 ہم سے پھر بھی ناراض ہو کیوں؟ کیا تم تسلی امی ہو؟
 اپنے ان پیارے بچوں کو اب منہ بھی لگانا چھوڑ دیا
 جن آنکھوں میں روز شرارت تھی ان آنکھوں میں آنسو اب کھو
 ان آپ کی پیاری آنکھوں کو اب ہم نے رُلانا چھوڑ دیا
 ہے گھر کی فضا سہمی سہمی، غمگین ہیں بچوں کے چہرے
 کب منہس کے کہو گی اسے بچو! کیوں ہم کو ستانا چھوڑ دیا؟

نہتی جو گن حُدا کی تلاش میں

اے خدا جنگل میں چھپ کر تجھ سے ملنے آئی ہوں
جیب میں تھوڑی مٹھائی بھی چھپا کر لائی ہوں
تجھ کو کیا معلوم کتنا چاہتی ہوں میں تجھے
تجھ کو تھوڑا دیکھ لوں تو چین آجائے تجھے
آسمان پر میں نے دیکھا دُور بینوں سے تجھے
دھونڈتی پھرتی ہوں پونے دو ہفتوں سے تجھے
آسمان پر چاند تاروں کے سوا کچھ بھی نہیں
جنگلوں میں دیو داروں کے سوا کچھ بھی نہیں
جھاڑیوں میں بھی نہیں ہے تو وہاں خرگوش ہیں
تیری خاطر بن کے جوگی بن میں جو دپوش ہیں

میری امی باہر آجاتی ہیں برقع اور ٹھکر
تو کبھی برقعے میں بھی آتا نہیں مجھ کو نظر
آج کل پردہ کوئی کرتا نہیں تیرے سوا،
پھوڑنے والی ہیں اب امی بھی پردہ اٹھا
چوری چوری مجھ سے مل جائیں بہت ہی نیک ہوں
امی کہتی ہیں کہ لاکھوں لڑکیوں میں ایک ہوں
پورے پانچ آنے فیروں کو میں دے کر آئی ہوں
ہاتھ میں چھوٹی سی اک تسبیح لے کر آئی ہوں
تجھ کو خوش کرنے کی خاطر جھوٹ بھی نہ بولا آج
کیا کہوں جب اپنے سر پر رکھ لیا نیکی کا تاج
جنگلوں میں آگئی سب اپنی گڑیاں بھوڑ کر
میں تو جو گن بن گئی ہوں تجھ سے ناتے جوڑ کر
چھپ کے امی سے وظیفہ بھی پڑھا کل رات کو
تاکہ وہ سن لیں نہ تیری اور میری بات کو

سات راتیں "توبہ استغفار" بھی پڑھتی رہی
 آگے ہی آگے میں تیری راہ میں بڑھتی گئی
 ادھی روٹی کھائی ہے اور ساتھ بس تھوڑی سی بھانہ
 آگئی ہوں بن میں لے کر اپنی ننھی "جانماز"
 اک اگر بتی بھی لائی ہوں ابھی سگادوں گی
 کر کے آنکھیں بند تیرے دھیان میں کھو جاؤنگی
 آنکھ میں آنسو ہیں اور تیرے لئے ہے دل اُداس
 ابھی جا اب ابھی جا کوئی نہیں ہے اس پاس
 لگ رہا ہے ڈر مجھے جنگل بہت سُنان ہے
 حوصلہ چھوٹا سا ہے، ننھی سی میری جان ہے
 دیکھ کر مجھ کو کسی بھیڑیا گر آگیا !
 اور اگر مجھ نگوڑی کو وہ ظالم کھا گیا
 دیکھ کر چھوٹی سی یہ تسبیح اور یہ "جانماز"
 توبہ روئے گا اے میرے خدائے بے نیاز

پھر یہ سب چیزیں مری امی کو تو دے آئے گا
 کچھ نہیں تو نہ سے بولے گا، تو روتا جائے گا،
 تجھ سے جب پوچھیں گی امی کیا ہو اجی کیا ہوا؟
 دیکھ کر امی کا چہرہ اتنا گھبرا یا ہوا
 تو نہیں یہ کہہ سکے گا تیری "بانو" مر گئی
 میری خاطر اپنی ماں کی گود حسالی کر گئی
 روئے گا بچھتا کے جب تو جنگلوں میں بار بار
 بھیڑیے کے پیٹ میں روؤں گی میں بھی زارتار
 کیسے پونچھوں گی تیرے آنسو بہت گھبراؤں گی
 تو بلائے گا، مگر کیسے میں باہر آؤں گی
 اپنی اتنا چاہنے والی کو مت برباد کر
 آسمانوں سے اتر کر اب میرا دل شاد کر
 گر نہیں آتا تو پھر اک کام کر دینا مرا
 یہ ضروری کام ہے مت بھول جانا اے خدا

جب تجھے فرصت ملے امی سے کہہ آنا کبھی
 تھوڑی سی بر فی منگا کر نیاز دوا دے مری
 اور فرشتوں سے بھی کہہ دینا میرے اچھے خدا
 میرا نام اس چھو کری نے آ کے تنگل میں لیا
 بھیڑیے کے پیٹ سے جنت میں لے جانا اسے
 بھول سے دھوکے سے دوزخ میں نہ پھینک آنا اسے



محترمہ مسز الو اور اُن کے بچے

(۱)

امی، میں اور بھتیجا کل اک شاخ یہ بلیٹے اُونگھ رہے تھے
 باغ کی بھینی بھینی خوشبو، چونچ سے اپنی سونگھ رہے تھے
 ہم پر پلنے پھینک رہا تھا۔ دُور سے سورج کالا کالا
 آدھے سوئے تھے آدھے جاگے، دُور ابھی تھارین اُجیالا
 اتنے میں اس پیر کے نیچے، آئے دو اسکول کے بچے
 ایک اشارہ کر کے بولا "دیکھو دو اُلو کے پتے"
 اُن کی گالی سُن کر امی، رونے لگے ہم دونوں بھائی
 بھاگ گئے "وہ دونوں، ڈر کر ہم نے ایسی راڑ مچائی

عہدِ جوانی منس منس کاٹا

اپنی گول آنکھوں سے امتی، ہم کوئی دوسرا نہ روئے
 اوڑھ کے سپنوں والی چادر، اُٹو، پتو۔ آج نہ سوئے
 امی! بابا تو کہتے تھے ہم دونوں اچھے بچے ہیں،
 پھر وہ بچے کیوں کہتے ہیں ہم دو اُٹو کے پٹھے ہیں؟

(۲)

اُٹو! دھرا سے پیارے بچو! ماں تم پر اپنی جاں دے!
 پونچھ لو اپنی گول آنکھوں سے، لمبے لمبے آنسو پیارے
 سچ کہتی ہوں تم دونوں ہو۔ ایک حسیں اُٹو کے بچے
 تم کو جو آکر دے گئے گالی۔ وہ ہوں گے اُٹو کے پٹھے!



نگوڑا

توہی جا کوٹھے پہ سوسن میں تو بس اب جا چکی
 تو بہ تو بہ کون واں جلے گائیں باز آ چسکی
 جب بھی میں اُد پہ مٹوں جاتی
 سامنے اُس کو ہوں پانی
 وہ نگوڑا مجھ کو تک کر جانے کیوں کہتا ہے "ہائے"
 اب کہو سوسن کوئی کیا خاک اس کوٹھے پہ جلے
 دس دفعہ میں کل گئی جب
 کیا بتاؤں اُف مرے رب
 دس دفعہ ہی میں نے پایا اُس کو اپنے سامنے
 مجھ کو تک تک کر لگا کم نخت دل کو تھامنے

اُذرا کوٹھے پہ جائیں

اُد ہیں چٹری سکھائیں

اُس نگوڑے مردوے کو مُنہ لگائیں گے نہ ہم
 وہ جدھر ہوگا اُدھر چٹری سکھائیں گے نہ ہم



پھول اور کانٹا

جھپٹے کے دقت شیشم کے درختوں کے تلے
 بل رہی تھی جب ہوا مسرور شاخوں سے گلے
 جب زمینِ خلد منظر کیفیت سے معمور تھی
 شام کی دیوی محبت کے نشے میں چور تھی
 شہر کی ویراں سڑک پر مجھ کو اک لڑکی ملی
 نیلگوں بلبوس میں مورت چھپی تھی نور کی
 ساتھ اپنے دھول اڑائے جس طرح بوج ہوا
 جس طرح سے پھول کے ساتھ ایک کانٹا ہو گا
 تمام کراؤں سے لقا کا عطر سے آلودہ ہاتھ
 نوجواں بھی آ رہا تھا ایک اُس کے ساتھ ساتھ

بنتِ عم

لڑکا :- نہیں آتی تو کیا ہے، ہم تمہیں انگلیش پڑھا دیں گے
 کتابیں مت مڑگانا، سب کی سب ہم کل ہی لادیں گے
 لڑکی :- نہیں اس کی ضرورت کیا ہے، یہ تکلیف مت کیجے
 مناسب ہے یہی، بی۔ اے کا پہلے امتحان دیجے
 لڑکا :- کتنی کیڑی ہیں کیوں آ رہے تم کو پسینے ہیں؟
 ابھی تو امتحان میں ٹھیک ہونے کو ہیںے ہیں
 لڑکی :- جی ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن مجھے ڈیڈی پڑھا دیں گے
 وہ کل ہی کہہ رہے تھے سب کتابیں مجھ کو لادیں گے
 لڑکا :- انہیں فرصت کہاں ہے، کیوں انہیں تکلیف دیتی ہو؟
 میں جب کتابوں تم کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی ہو

لڑکی :- بہت رشتی ہے جینم دھاڑ سب بچوں کی اس گھر میں
 پڑھے گا خاک کوئی اتنا داؤد بلا ہو جس گھر میں
 لڑکا :- ارے ہر شام کُنج باغ میں ہم بیٹھ جائیں گے
 اُٹھے آندھی یا طوفان ہم تمہیں انگلش پڑھائیں گے
 لڑکی :- اجی چھوڑو یہ باتیں اپنا دل تم کو چکے ہو گم
 کو ناصات! مجھ سے عشق کرنا چاہتے ہو تم!



دردن اور لارڈ کرزن

سرور :- ادھر دیکھئے اک نظر بندہ پرورد
 کہ ملنے کو تشریف لائے ہیں سرور
 ذرا اپنے چہرے سے زلفیں ہٹا کر
 ہمیں دیکھئے اک نظر مٹا کر
 یہ "دیوانِ غالب" یہ دیوانِ حالی
 یہ ہے داستانِ "امامِ غزالی"
 تلاشِ ان کی کرتا رہا ہوں مہینوں
 بڑی مشکلوں سے ملی ہیں یہ تینوں
 میں بارش میں بھی آج پھرتا رہا ہوں
 میں کچھڑ میں سڑکوں پہ گرتا رہا ہوں

نہ محبتوں کبھی کیٹھن کام کرتا
 کہ وہ ایسے موسم میں آرام کرتا
 مگر میں چراغ محبت جلا کر
 انہیں ڈھونڈ لایا افریروں میں جا کر
 بس اب مجھ سے تم "شکر یہ" کہنا
 اسی طرح بے درد خاموش رہنا
 جب آیا انہیں گھر میں مصروف دیکھا
 انہیں "دفتر دل" سے "موقوف" دیکھا
 مشینوں پہ کپڑے سٹے جا رہے ہیں
 رومالوں پہ بچے کئے جا رہے ہیں

جہیز اپنا سینا اری اے سینا
 مگر میرا چاک گریباں نہ سینا
 ارے اس مشین کو میں کھڑکی سوچتیوں
 ہوئی کتنے ٹکڑے ہیں اوپر پر دیکھوں

یہ "ڈر کوپ" ہے اور ڈرپوک ہوں میں
 مگر بھینک دینے پہ پردہ دکھائوں میں
 ہنسنا ہوں تم کو تو ہنستی نہیں ہو
 پھنسا ہوں تم کو تو ہنستی نہیں ہو
 ارے میرے اللہ بڑی ہے یہ بچی
 نہیں چل سکے گی محبت کی چپکی
 نگاہیں اٹھا کر ادھر دیکھ درزن
 کھڑا ہے تیرے سامنے لاد کر زلی



چلو چھوڑو مسٹر یہ بکو اس کب تک
 تم اس گھر میں تڑپو گے بے اس کب تک
 کبھی لڑکیاں ایسے ہنستی نہیں ہیں
 ہنسنا تو بے درد ہنستی نہیں ہیں

بڑا ہے محبت میں ڈائریکٹ ہونا
 پسند آئے بھی ایسے ریکلیٹ ہونا
 یہ کرے میں کتنی ہوا آ رہی ہے
 یہ زلفوں کو بیکار اُجھار رہی ہے
 کہو تو میں کھڑکی کا پردہ گہرا دوں؟
 قریب آئے چہرے سے زلفیں ہٹا دوں؟
 یہ کینٹ کتنا اُجھکتی ہیں تجھ سے
 اُجھنا یہ تجھ سے اُجھنا ہے مجھ سے
 مچلنا رہوں کب تک دُور رہ کے
 قریب آؤں ہیں ایک دُور میں کہہ کے؟



رضیہ :- کم از کم یہ سو قدم دُور مجھ سے
 چپٹ در نہ کھاؤ گے بھر پور مجھ سے

چلے آئے پھر عشق کا سا زلے کر
 بلاؤں میں امی کو آواز دے کر؟
 امی دیکھئے یہ

 مے مے خاموش خاموش بس بس
 سرور :-

ابھی بس ابھی جا رہا ہوں میں واپس
 میرے عشق کو پاؤں سے تم رگیدو
 مگر ان کتابوں کی "قیمت" تو مے دو
 مگر یاد رکھو کہ قیمت بڑی ہے
 ہے برکھا کا موسم ملن کی گھڑی ہے
 یہ برکھا کا موسم جہنم میں جاؤ
 رضیہ :-

نہ "شیطان" کوئی میری جنت میں گئے
 مجھے یاد ہے کل درختوں کے نیچے
 گھنی "عشق بیجاں" کی بیلوں کے نیچے

یا تھا م جب تم نے اک ہاتھ میرا
 ستا یا بہت، مجھ کو جی بھر کے پھیرا،
 بہت کچھ تمہیں پیشگی دے چکی ہوں
 نہ پھر مانگنے کی قسم لے چکی ہوں
 لئے اپنا دل بھاگ جا لا رڈ کر زن
 نہیں تو تمہیں پیٹ دے گی یہ درزن



بھائی بہن

اے کے اپنی اداؤں کے لشکر وہ دے پاؤں گھر سے آتی ہے
 چاند حیرت سے اُس کو نکلتا ہے سوچتا ہے کہ ہر یہ جاتی ہے

گلستاں کی جیس ہواؤں میں اس کی ہر اک مراد کھلتی ہے
 دن میں کہتی ہے جس کو وہ بھائی رات کو چھپ کر اُس سے ملتی ہے



فیصلہ

محبت کروں تجھ سے میں اے حسینہ؟
مگر میری صورت کچھ اچھی نہیں ہے
یہی سوچتا ہوں کہ وہ پھر بھی کوشش
مگر تیری صورت کچھ اچھی نہیں ہے
چلو پھیر لیں اپنی اپنی نگاہیں
نہ تم ہم کو چاہو نہ ہم تم کو چاہیں



آخری گالی

پھر وہی چھٹریں پیار کی باتیں آپ نہیں باز آئیں گے؟
دیکھئے ہم اٹھ کر چل دیں گے، آپ نہیں گر جائیں گے
تو بس قزح چولہے میں جلے کالی گھٹا کو آگ لگے
کیا ہم دیکھ نہیں سکتے ہیں؟ آپ ہمیں دکھلائیں گے؟
آنکھیں ہماری اچھی ہیں تو آپ کو ان سے کیا مطلب
جیسی بھی ہیں آپ اب ان کے پیچھے ہی پڑ جائیں گے؟
آپ نے تصویریں مانگی تھیں ہم نے بس یوں ہی دے دیں
کیا معلوم تھا آپ اب ان سے دل کا عمل سبائیں گے
بڑی بڑی نظریں چہرے پر ڈال رہے ہیں اُف تو بہ!
ہم اپنے دونوں گالوں کو جا کے ابھی دھو آئیں گے

اتنے لمبے لمبے خط ہم کیسے پڑھیں ہائے اللہ،
 جب بھی آئیں گے ساتھ اپنے کوئی مصیبت لائیں گے
 ہم پر آپ نے نظیں لکھ دیں، اس پر بھی ہم خاموش ہے
 نظموں کے بعد آپ تو ہم پر نثر بھی اب چپکائیں گے
 یہ جھکے، یہ سینٹ، یہ نظیں عشق کا سب ساز و سامان
 اب واپس لے جائیے صاحب بس میں نہیں ہم آئیں گے
 ہم کہتے ہیں شہر میں ہوں گی نو سو لڑکیاں کم سے کم
 یہ کیا ضد ہے پیار کی مالا ہم ہی کو پستائیں گے
 کریجے رضیہ سے محبت ہم پر کیجے نظرِ کرم
 وہ بیچاری پھنس جائے گی ہم اس کو سمجھائیں گے
 عظمت بھی اچھی خاصی ہے اس سے لڑائیجے آنکھیں
 آپ اس بندی کی خاطر کب تک زحمت فرمائیں گے
 خال صاحب آتے ہیں تو کیسے کہیں ہم "مت آؤ"
 آتے ہیں تو ہم کیوں روکیں کھا تو نہیں وہ جائیں گے

دیکھئے ہاتھ لگایا تو ہم ڈر کر شور مچا دیں گے
 امی، ابا، پھپھو، خالہ، دوڑ کے سب آجائیں گے
 پہلے ہم کو بہن کہا۔ اب فکر ہمیں سے شادی کی
 یہ بھی نہ سوچا بہن سے شادی کر کے کیا کلائیں گے؟



مولوی صاحب کا خواب

دیکھائیں نے جس کو چھپ کے
اپنے جسے کی کھڑکی سے
جس کے لئے تعویذ کرائے
ندی نالوں میں ڈلوائے

اُس کے گھر میں جا پہنچا ہوں
بالکل اُس کے پاس کھڑا ہوں
گھر میں بیٹھی ہے وہ اکیلی
ماں ہے پاس، نہ کوئی سہیلی

پردہ اُس نے چھوڑ دیا ہے
برقعہ اُس کا دور گرا ہے

پہرے پہ خوشبودار پسینہ
الٹے جوبن، باغی سینہ

گوری گوری چنچیل باہیں،
وصل کی خواہاں شوخ نگاہیں

سر پر لا کر ہاتھ حنائی
لے کر اک دل چنیک انگڑائی

کہتی ہے "چھوڑو قاضی واصلی
میں بھی راضی، تم بھی راضی!"



ادیب کی محبوبہ

تمہاری اُلفت میں ہار مومنم پر میر کی غزلیں گارہا ہوں
 بہتر ان میں چھپے ہیں نشتر جو سب کے سب آزارہا ہوں
 بہت دنوں سے تمہارے جلوے خدیجہ مستور ہو گئے تھے
 ہے شکر باری کہ سامنے اپنے آج پھر تم کو پا رہا ہوں
 بحان عصمت کا اور تھ کر تم فسانے منٹو کے پڑھ رہی ہو
 ہیں کے بیدی کا "گرم کوٹ" آج تم سے آنکھیں ملارہا ہوں
 تمہارے گھرن ہم ہر شد کا لے کے آیا سفارش سی خط
 مگر تعجب ہے پھر بھی تم سے نہیں میں کچھ فیض پارہا ہوں
 بہت سیدھی سی بات میری بجانے تم کیوں نہیں سمجھتیں
 قسم خدا کی کلام غالب نہیں میں تم کو سنارہا ہوں

تمہاری زلفت سیہ پہ نقیب کس سے لکھواؤں تم ہی بولو
 بشری عبادت بریلوی کو میں تارو سے کر ملا رہا ہوں
 میں تم پہ ہوں جاں نثار اختر قسم ہے منشی فدا علی کی
 بہت دنوں سے میں تم پہ سحر سے جادو ٹوٹنے کر رہا ہوں
 اگر ہو تم ہا بھرہ تو پھر مجھ سے مل کے مسرور کیوں نہیں ہو؟
 تمہارے آگے اُوپندرنا تھا شک بن کے آنسو بہا رہا ہوں
 جیسے ہوزہرہ جمال ہو تم، مجھے ستا کر نہال ہو تم
 تمہارے یہ ظلم تشرۃ العین کو تہانے میں جا رہا ہوں
 میری محبت کی داستان سن کے رو پڑے جوش ملیحانی
 نکلا کے پنکھے سے اُن کے آنسو ابھی دہاں گئے ہیں آ رہا ہوں
 پلا دو آنکھوں سے تاکہ مجھ کو کچھ آل احمد سرور آئے
 بہت ہیں غم مجھ کو عاشقی کے پیسے بناؤ لگسارہا ہوں
 میری تباہی پہ چھاپ دیں گے نقوش کا ایک خاص نمبر
 طفیل صاحب کے پاس سارے مسودے لے کے جا رہا ہوں

وزیر آغا پٹھان ہیں ساتھ ساتھ یاروں کے یار بھی ہیں

پکڑ کے وہ تم کو پٹ دیں گے، میں کل اہتیں ساتھ لا رہا ہوں
حکیم یوسف حسن نے جب میری نہیں دیکھی تو روکے ہوئے

جگر ہے زخمی تباہ گردے یہ بات تم سے چھپا رہا ہوں
یہ صبح آباد آج جا رہا ہوں میں جوش لاؤں کہ آم لاؤں؟

ہیں دونوں چیزیں وہاں کی اچھتی میں لاؤں کیا تملار ہوں
جو حکم دو واجبہ تبسم کا کچھ تبسم میں تم کو لا دوں

تمہارے ہونٹوں پہ غم کی موجوں کو دیکھ کر تملار ہوں
فسانہ عشق مختصر ہے، قسم خدا کی نہ بوری ہونا

فراق گور کھپوری کی غزلیں نہیں میں تم کو سنار ہوں
میری محبت کی داستان کو گدھے کی مت سرگزشت سمجھو

میں کرشن چندر نہیں ہوں ظالم یقین تم کو دلار ہوں!



ضرورت رشتہ اور تصویریں

(۱)

مئی اُس سے نہیں، توبہ اکروں کی قدر خاک اس کی
مجھے لگتا ہے دُراس سے بہت لمبی ہے ناک اس کی

ہوئی شادی تو پہلا کام، میں ڈائی دورس مانگوں گی
میں اُس کی ناک پر کیا اپنا اور کوٹ مانگوں گی
نہیں بابا، نہیں بابا،

(۲)

یہ آپکن پہنے بیٹھے ہیں غلط بولیں گے انگریزی
ہلا کو جیسی آنکھیں ہیں نگاہیں ان کی چٹنگیزی

میں کوئی ملک ہوں جو مجھ پہ حملہ کرنے آئے ہو

میاں جواد۔ میں اک تلوار ہوں کیوں مرنے آئے ہو
نہیں جھپتے، نہیں جھپتے۔

(۳)

”وٹامن بی“ کی کچھ اس میں کمی معلوم ہوتی ہے
میرے اللہ منصف اس کی مکتبی معلوم ہوتی ہے

میں بیٹ کرتی ہوں امی ہوگا یہ بیمار برسوں سے
بچار امپٹن ہوگا کم از کم چار برسوں سے
نہیں امی، نہیں امی۔

(۴)

بہت خط اس نے بھیجے ایک بھی بھیجا نہ تو لیٹر
میں پچھلے دیک اس سے کر چکی ہوں ڈراپ یہ میٹر

میاں تم مشرقی اور مغربی ہے حساندان اپنا
میں باز آئی محبت سے اٹھا لو پاندان اپنا
نہیں جھپتے، نہیں جھپتے

(۵)

جی غنڈہ ہے یہ اور نام ہے بی اے شریف اس کا
شراب اور بد معاشی میں نہیں کوئی حریت اس کا

ادھر یہ ڈال کر دورے مجھے اپنا بنالے گا
ہو تم بھی خوبصورت، یہ نظر تم پر بھی ڈالے گا
اری لڑکی۔ اری لڑکی۔

(۶)

بنگا ہیں نیچی نیچی نام ہے ایم۔ اے لطیف اس کا
خایا تو یہ تو یہ جسم ہے کتنا نجیف اس کا

میری نظروں کا پہلا تیر بھی یہ سہنہ نہیں سکتا
یہ مرجائے گا بیچارہ یہ زندہ رہ نہیں سکتا
چلو آگے، چلو آگے،

(۷)

یہ اس کے منہ پہ مٹر ڈر پھٹے منہ کس نے لکھ ڈالا؟
یہ میرا کام تھا لیکن شرارت کر گئی خالہ

ذرا ٹھیرو میں اس کے ساتھ خالہ کو بھیناؤں گی
اسی خالہ کو "بیگم در پھٹے منہ" میں بستاؤں گی
"اری لڑکی - اری لڑکی"

(۸)

یہ ایل ایل بی ہے پر اللہ بچائے ان وکیلوں سے
یہ ہر اک بات منوائے گا تانوتی دلیلوں سے
مجھے ڈائی دورس یہ بائی فورس دے سکتا ہے حیلوں سے
میرا گھر لوٹ لے گا قریبوں سے اور اپیلوں سے
نہیں دیکھو، پرے پھینکو۔

(۹)

یہ شاعر ہے یہ ہر لڑکی کو آہیں بھر کے ملکتا ہے
جب اگتا جلے گا کہہ دے گا "میڈم تجھ میں" سکتا ہے
کرے گا شاعری دن بھر نہیں پیسہ کمائے گا
یہ بھوکا رہ کے راتوں کو گرہ مجھ پر لگائے گا
نہیں امی - نہیں امی۔

(۱۰)

ارے یہ ڈاکٹر بنیں حسینوں کی ٹوٹے گا
گئے گا دھڑکنیں دل کی، گریبانوں کو کھولے گا

شریک زندگی بن کر میں جینے کو توجی لوں گی
جو اس پر شک ہو ایں نکچر آؤ دین پی لوں گی
نہیں بابا، نہیں بابا

(۱۱)

مئی اب بس کرو بس غلط ہیں سب یہ تدبیریں
محبت میں نہ کام آتیں ہیں تصویریں نہ تقریریں!
جو پچ پوچھو شراب عشق سب کتنی رہی ہوں میں
وہی اچھا ہے جس سے کوڑ شپ کتنی رہی ہوں میں
بہت اچھا
بہت اچھا

○

ایک اور ضرورتِ لاشہ اور تصویریں

(۱)

پولیس کپتان کی پوتی ہے یہ۔ اس سے نہیں امی

جہاں ڈانٹا، پولیس آجائے گی فوراً وہیں امی
ورا "فوں فوں" کیا تو اپنے ڈیڈی کو بتا دے گی

یہ خود باہر رہے گی اور مجھے اندر کر دے گی

نہیں امی، نہیں امی

(۲)

نمی یہ وہ ہے جو بیٹے میں ہا کی بیچ کھیل سکتی

خوشی سے شیخ کی موٹریں اس نے لفٹ کی سکتی

وہ اس گوری پہ کالا ہاتھ اپنا دھر چکا ہوگا

وہ موقع پا کے موٹریں اسے کس کر چکا ہوگا

نہیں امی، نہیں امی

(۳)

عدالت حسن کی ہے، بن کے مجسٹریٹ بھیجی ہیں

یہ شادی کے لئے "لزم" کو دینے ڈیٹ بھیجی ہیں

پچھوا ان کو تو بولیں گی "رذالت کر رہے ہو تم"

پر رہے ہٹ جاؤ تو ہیں عدالت کر رہے ہو تم

نہیں امی، نہیں امی

(۴)

نمی کیا یہ وہی ہے جس کی تم ہو عاشق و شیدا

یہ ہندی ہو کے کیوں انگلینڈ میں جا کر ہوئی پیدا

سوئٹزر لینڈ میں ہے باپ امریکہ میں ماں اس کی

"چمن" میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستان اس کی

نہیں امی، نہیں امی

(۵)

بھویں تنہی ہیں کتا ساتھ میں ہے تن کے بھیجی ہیں

کلام داغ شاید پڑھ کے یہ بن سٹن کے بھیجی ہیں

کہیں گی میرے کُتے کے لئے بھی پار ٹرلاؤ

کسی کا شرادہ ادا کی "دید" سے اس کو بھی بہلاؤ
نہیں امی، نہیں امی

(۶)
سنا ہے فلم میں بھی یہ جینتہ کام کرتی ہے

نہ جانے ایک دن میں کتنے دل نیلام کرتی ہے
جو میرا دل گیا کوئی مجھے ولین بنا دے گی

یہ دو ہی چار سینوں میں مجھے گھر سے بھگا دیگی
نہیں امی، نہیں امی

(۷)

اے اس کو تو اس دن پارٹی میں ہم نے دیکھا تھا

کسی لڑکے نے اس پر دُور سے اک پھول پھینکا تھا

یہی تھے "مپس" کانوں میں یہی ٹیشو کی ساری تھی

نظر سے بچا کر اس نے مجھ کو آنکھ ماری تھی

نہیں امی، نہیں امی

(۸)
ہے ریٹ ہاتھ میں، کیا بیڈ منٹن اس نے ٹیکھی ہے

تقیّا مرچ کی مانند کتنی تیکھی تیکھی ہے

اسی ریکٹ سے اک دن میرا قصہ پاک کر دے گی

یہ میرے عشق کو دو دن میں ٹیل کا ک کر دے گی

نہیں امی، نہیں امی

(۹)

دکن کی جادو گرنی آئی دام زلف کو کھولے

کے "قینچی" کو "خینچی" اور "قسم" کو یہ "خضم" بولے

قسم کھانے کے دھوکے میں "خضم" شاید یہ کھا جائے

میری امی جوانی میں نہ مجھ کو موت آجائے

نہیں امی، نہیں امی

(۱۰)

من ہے فن موسیقی میں ماہر ہے یہ نیک ابلا

کہے گی مجھ سے "میں گاؤں گی تم پھیڑ و ذرا طبل"

میرے گھر کی چھتیں اُڑ جائیں گی سب اسکی تانوں سے
نہ سارنگی جدا میں کر سکوں گا اس کی رانوں سے
نہیں امی، نہیں امی

(۱۱)

غزالی آنکھ، چہرہ پھول، شرمیلی نظر اس کی
حصیں کالوں پہ دو دو تل ہیں اور غائب کرا سکی
امی یہ سرفراز کی نہیں میرے نصیبوں میں
یہ بٹ جائے گی فوراً شاعروں میں اور ادیبوں میں
نہیں امی، نہیں امی

(۱۲)

کھڑی ہے ریگ ساحل پر۔ امیر البحر کی پوتی
صراحی دار گمہ دن میں ہیں کچھ مرجان، کچھ موتی
میرے دل کے سینے کو چٹانوں سے نہ ٹکرائے
کسی ملاح سے مجھ کو سمندر میں نہ پھکوا دے
نہیں امی، نہیں امی

(۱۳)

امی اب تو سمندر ہی میں پھینک آؤ یہ تصویریں
نہیں ڈالو میرے قدموں میں تم شادی کی زنجیریں
جو سچ پوچھو۔ یہ سب شادی نہ کرنے کے بہانے ہیں
مچلتا تیر ہوں سب لڑکیاں میرے نشانے ہیں
مجھے دنیا کی ہر لڑکی حبس معلوم ہوتی ہے
ہر اک صورت مجھے سحر آفریں معلوم ہوتی ہے
اگر ان لڑکیوں میں ایک سے شادی کروں گا میں
یقین ہے مجھ کو، باقی کے لئے آہیں بھڑکائیں
کہو اب تم ہی امی میں کرونگا کس طرح شادی
میں ڈیڑی کی طرح ہرگز "قناعت" کا نہیں عادی
"ارے بڑے ارے بڑے"



تاش کے پتے پھینکویارو تاش کے پتے پھینکویار

سینے کا گلزار کھلاتی

ڈوالی کی سی مگر چمکاتی

آج تو آتی ہے وہ اکیلی

ساتھ نہیں ہو سکی سیلی

کیوں بنی لی اونگھ رہے

اُس کی خوشبو سونگھ رہے

جب وہ آئے کہہ کے "ہائے" آنکھ تو اُس کو مار

تاش کے پتے پھینکویارو تاش کے پتے پھینکویار



غندڑے

تاش کے پتے پھینکویارو تاش کے پتے پھینکویار

سامنے دیکھو کون آتی ہے کر کے سات سنگار

تاش کے پتے پھینکویارو تاش کے پتے پھینکویار

پہچانا ہے کون حسینہ؟

تھام لو اپنا اپنا سینہ!

لنگڑے سیٹھ کی یار آتی ہے

ہفتے میں دو بار آتی ہے

چوڑیوں کی جھنگار سناتی

پانسیا کے گیت سناتی

آتی یہ ہر بار ہے یارو کر کے سات سنگار

اس سڑک پر اس آنکھ نے دیکھا چلبلی پیاری اک حسینہ کو
 آجا کر بیٹے ادھر ذرا کہہ کے ماردی آنکھ اس لعینہ کو

اپنے گود سے ہاتھ کا تھپڑ میرے منہ پر جما دیا اس نے
 یوں لگا جیسے گرم اک بوسہ میرے منہ پر لگا دیا اس نے

اس حسین ہاتھ کی حسین خوشبو اب بھی آتی ہے سونگھ لیتا ہوں
 دو گھڑی بند کر کے میں آنکھیں اپنے تانگے میں اونگھ لیتا ہوں

اور کیا چاہیے تھا بابو جی



ایک آنکھ والا

اے کے بڑی کا ایک لب کش ایک چابک لگا کے گھوڑے کو
 تانگے والا میرا لگا کہنے دیکھ کر اک حسین جوڑے کو

بابو جی ایک دن کا ذکر ہے یہ میں نے ریشم کی مشہدی لگی
 آنکھ پر کچھ جھکا کے باندھی تھی یہ میری آنکھ چھپ گئی تھی

منہ میں قینچی کا ایک سگرٹ تھا کان میں عطر کی پھری تھی
 کسی معشوق کو تن تنہا دھونڈتی ہر نگاہ میری تھی

اس سے اور اسی سے

(۱)

نہیں کے چاند تر احسن آسمانی ہے
ہر ایک جلوہ تراک نہی کہانی ہے
ہے تیرے جلوں کو نشندہ میری عمر کی رات
زہے نصیب کہ تو موری شریکِ حیات
ہے میرے اچھے ہوئے گھر کو انتظارِ ترا
تو اے بہارِ اسے کے رشکِ خلد بنا
گھر آؤں گا جو ہر شام ہو کے میں بے حال
نہال دل کو کریں گے یہ تیرے پھولِ گال
گلے میں ہوں گے مے ہا تیری بانہوں کے
چمک انجلیں گے تنکے تری نگاہوں کے

کرے گی زندہ مجھے تیری دلنشیں گفتار

مرے چین میں ہے گامِ سدا یہ حُسنِ بہار
کھلے گی دل کی کلی روحِ شاد ماں ہوگی
بہشت ہوگی اُسی گھر میں تو جہاں ہوگی
قدم نما و فروزا کہ خانہ خانہ قسمت

(۲)

خدا کے واسطے کھو لو بھی آ کے دروازہ
میں کتنی دیر سے باہر کھڑا ہوں چینِ رہا
اگر علیل نہ ہو آپ کا مزاجِ شریف
تو پنکھا جھلے ذرا اٹھ کے کیجئے تکلیف
یہ چار پانی مری ٹیڑھی کیوں بچھائی ہے؟
بھلا کتنی یہ کیوں فرش پر گرائی ہے؟
الہی کون یہ پانی کا دے گا اتنا بیل؟
خدا کے واسطے کرنل کو بندائے کاہل

چہا تیاں میرے اللہ سب کی سب کچھ!
 تمام عمر ہی شاید رہو گی تم بچی،
 تمک کی کان اُلٹی ہو آج سالن میں
 اٹھا پایا لہ پٹخ دے یہ جا کے اگلن میں
 بس اٹھ بھی اب کوئی ایسا برا تو حال نہیں
 یہ مجھ غریب کا گھر ہے یہ ہسپتال نہیں
 دبا ہے پر میرے اٹھ کے! اٹھ بھی اٹھ اے سست!



میاں کے دوست

اُسے میاں کے دوست تو آتے چلے گئے
 چھوٹے سے ایک گھر میں سماتے چلے گئے
 وہ قہقہے لگے کہ چھتیں گھر کی اڑ گئیں
 بُنیاد سارے گھر کی ہلاتے چلے گئے
 بکواس اُن کی سُن کے خیا طین رو پڑے
 رویا جو ایک سب کو رلاتے چلے گئے
 نوکر نے آج چائے کے دریا بہا دئے
 دیا سمندروں میں سماتے چلے گئے
 الماریوں میں سم گئے بکٹوں کے بٹن
 چُن چُن کے ایک ایک کو کھاتے چلے گئے

کھانے کی چیزیں ناورد و نایاب ہو گئیں
 دلی کا قتل عام چلتے چلے گئے
 شیروں کی طرح ٹوٹ پڑے آکے میز پر
 جو چیز بھی ملی، وہ چباتے چلے گئے
 جیسے پولیس میں پکڑتا ہے چور کو
 ہر شے پکڑ کے پیٹ میں لاتے چلے گئے
 انجن کی طرح منہ سے اُگلنے لگے دھواں
 افسر گروں کی راہ گراتے چلے گئے
 ہر سمت پھینک پھینکے ماچس کی تیلیاں
 کوڑے کا فرش گھر میں بچاتے چلے گئے
 کمرے میں گھومتے ہوئے کیچر بھرے وہ برٹ
 تالین کے نصیب جگاتے چلے گئے
 دیواروں سے جکے لہے پھڑپھڑے ہوئے دھڑ
 ہر نقش ماسوا کو مٹاتے چلے گئے

آوازیں "آخ تھوخ" کی ہوتی رہیں بلند
 سوئے ہوئے گلوں کو جگاتے چلے گئے
 کوئی کتاب اپنے ٹھکانے نہ رہ سکی
 ہندی کو فارسی میں بلاتے چلے گئے
 اخباروں کی وہ دھجیاں بکھریں کہ کیا کہوں
 اب ان سے وہ نگاہ کے ماتے چلے گئے
 دیواریں وہ نہیں رہیں وہ در نہیں رہا
 جس گھر پہ مجھ کو ناز تھا وہ گھر نہیں رہا



بیوی کی سہیلیاں

آئی جو ایک اور بھی آتی چلی گئیں
 چھوٹے سے ایک گھر میں سماتی چلی گئیں
 بچوں کی فوج سے ہمیں گھر پر حملہ نہ
 ہم دشمنوں کے ہوش اڑاتی چلی گئیں
 غنیمت دہن اگلے رہے دودھ بار بار
 یہ بار بار دودھ پلاتی چلی گئیں
 ننھوں نے ڈرائنگ روم میں دریا بہا دیے
 دریاؤں میں یہ بند لگاتی چلی گئیں
 بچوں نے چھوٹے ناک سے نغمے سُرد سُرد
 ناکیں کپڑے کے چھوٹے یہ کراتی چلی گئیں

دیوار پر جہاں بھی سفیدی نظر پڑی
 کتے کے پھول اُس پہ بناتی چلی گئیں
 اوراق ہر کتاب کے اُلٹے لگا کے تنوک
 پیکوں کی مہراں پہ لگاتی چلی گئیں
 کھینچے اٹھوں نے اُکے میرے ریڈیو کے کانا
 چاروں طرف سے اُس کو بجاتی چلی گئیں
 کھانے میں نقص اٹھوں نے کالے ہزارہا
 ہر ناپسند چیز کو کھاتی چلی گئیں
 بولی جو ایک کامیں "توب بولی کامیں گائیں"
 پھر کامیں کامیں کامیں "سناتی چلی گئیں"
 اس گھر میں آ کے کھلنے لگے سب گھر کے راز
 پرے پرے ہوئے تھے اٹھاتی چلی گئیں
 ہر ایک کا تھا یاد انہیں شجرہ نسب
 ہے کون کس کا باپ؟ بتاتی چلی گئیں

ہمسایوں کے سر کی چھامت کے بعد بھی
قبینچی زبان کی یہ چلاتی چلی گئیں
ہر سال ان کی عمر گھٹی چار پانچ سال

ہر سال ”عمر غیر“ بڑھاتی چلی گئیں
دلہن کی طرح گھر تھا ہمارا سجا ہوا

بیوہ کی طرح اس کو مٹاتی چلی گئیں
دور کے آج مانگے ہا ہوں یہی دعا
اس گھر میں یہ بلائیں پھر آئیں سے خدا



سُسرال کی جیل

(ایک قیدی بہو کی فریاد)

کیا لکھوں امی آپ کے خط کے جواب میں
کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں
سُسرال والوں نے مجھے ڈالا عذاب میں
یوں دب گئی ہوں جیسے ورق ہو کتاب میں
جہنم کی موج رہ نہیں سکتی چناب میں
میں ہوں ”سمند ناز“ پر پاپے رکاب میں

کل مجھ سے سچ کہا چچا غالب نے خواب میں
”بہتی ہے خوں سے ساس سے نار اہتباب میں“

لیوے نہ میرا نام ”ستم گز“ کے بغیر
سوئی نہیں کہی مجھے ”کافر“ کے بغیر

کہتی ہے آگئی مرے گھر پر کئے بغیر
 بستر بچھا دیا مرے در پر کئے بغیر
 آفت یہ آگئی مرے سر پر کئے بغیر
 کیوں روز مجھ سے لیتی ہے ٹکر کئے بغیر
 کیوں ڈالتی ہے چائے میں "شکر" کئے بغیر
 میں تجھ کو کھینچ ماروں گی پتھر کئے بغیر

پتھر جو ماروں میں تو نہ رونا جواب میں
 رہ ایسے جیسے پاؤں لہے ہے جواب میں

ہنستی ہوں جب ذرا "دُرخِ دلدار" دیکھ کر
 روتی ہے میری ہمت دیدار دیکھ کر
 جلتی ہے میری تابش رخسار دیکھ کر
 کڑھتی ہے میری چلبلی رفتار دیکھ کر
 ہنستی ہوں میں یہ ساس کے اطوار دیکھ کر
 جیسے شہید ہنستا ہے تلوار دیکھ کر

یہ ساس ہے کہ شیر چھپا ہے نقاب میں
 اللہ کسی کو ساس نہ دیوے شباب میں

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیوں جگر کو میں
 سوتی ہے وہ سنبھالتی ہوں ساسے گھر کو میں
 بلو کہ چپ کراؤں کہ ماروں سسر کو میں
 فرش زمین دھوؤں کہ مانجوں لگر کو میں
 کیوں اپنا گاؤں چھوڑ کے آئی نگر کو میں
 رورو کے یاد کرتی ہوں قادرِ مگر کو میں
 دکھتی ہے ساس ہی مجھے دیکھوں جدھر کو میں
 ہر اک سے پوچھتی ہوں کہ دیکھوں کدھر کو میں
 ناز و ادا سے مقام کے اپنی کمر کو میں
 جب اپنے دکھ مناؤں قمر کے پدر کو میں
 کہتے ہیں دیکھ آگ لگا دوں گا گھر کو میں
 سننا نہیں ہوں دکھڑے کسی کے سحر کو میں

گھائل کروں گا دل کو نہ زخمی جگر کو میں
اے کاش جانتا نہ تیری رہ گزر کو میں

اچھا یہی ہے ڈھونڈ لے راحت غراب میں
اماں کا ذکر کفر ہے میری جناب میں

دیووں سے بھی ہیں بڑھ کے میری دیو رانیاں
پیپر میں چھاپ دوں گی میں ان کی کہانیاں
”پچھلی طرہ کو پاؤں“ ہیں ان کی نشانیاں
چو لھے میں جائیں ان کی یہ خطا لم جوانیاں
کرتی ہیں راج گھر پہ یہ شیطان کی نانیاں
اس گھر میں فٹ ہیں جیسے گھڑی میں کمناں
جادو گروں سے سیکھ کے جادو بیانیاں
کرتی ہیں مجھ غریب پہ یہ ظلم رانیاں
کیا بکھٹوں اُن کی مجھ پہ ہیں کیا مہربانیاں
ہر بات میں دکھاتی ہیں یہ نکستہ رانیاں

اک دو نہیں ہیں خیر سے چوڑا ہیں رانیاں
خام و سحر یہ کرتی ہیں ریشہ دوانیاں

رہتی ہوں رات دن میں اسی بیچ و تاب میں
پہنچا دیں سائنس دان انہیں ماہتاب میں

تندوں کی ہر نگاہ جگر تک اتر گئی
اپنے خسر کی ڈانٹ میں سنتے ہی ڈر گئی
پہلی ہو تو خیر سے اللہ کے گھر گئی
ہنس ہنس کے جینے آئی تھی درد کے مر گئی
آئے گی تیسری بھی اگر میں گزر گئی
”اب آبروئے غیبیہ اہل نظر گئی“
کہتے ہیں تڑکے تڑکے ہو کیا تو مر گئی؟
اُٹھو بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی!

دیور ہیں یا کہ زہر لائے گلاب میں
جلیبٹوں کا ذکر بھیل گئی انتظار میں

دو ہمایاں

- شکیلہ:- تمہارے بچے ہماری بلی کی دم پکڑتے ہیں ان کو روکو
- شکیلہ:- تمہارے مرغے ہماری چھت پر اذان دیتے ہیں ان کو روکو
- عقیلہ:- تمہارا بکرا ہمارے آنگن میں آگھسٹا تھا ہلا کے ڈاڑھی
- شکیلہ:- دو ہتھروں سے اُسے بھگایا وہ جا رہا تھا اٹھا کے ساری
- شکیلہ:- تمہاری بچی ہماری نانی کو "پوپلی" کہہ کے بھاگ جائے
- شکیلہ:- تمہارا بچہ ہمارے نانا کو "غنڈہ" کہہ کہہ کے منہ چڑائے
- عقیلہ:- تمہارا گناچمن میں گھس کے ہمارا سب دودھ پی گیا ہے
- شکیلہ:- جوانی پیٹے کو کیا کہوں میں ابھی ابھی کھا کے گھی گیا ہے
- شکیلہ:- میں جانتی ہوں کہ میرے کُتے کو اس پہ تڑنے بھی کیا مزادی
- زبان سنبھال اپنی دہن بھانپ میں تجھ کو دلوں گی حرامزادی

- عقیلہ:- حرامزادی تو وہ تھی جس داشتہ نے تجھ کو جسم دیا تھا
- شکیلہ:- تیرا جیس باب تیری اماں کو ناگ پور سے بھگا کے لایا
- عقیلہ:- گایا جو پکڑا تو میرا سسرا ہی کلمو نے کو چھڑا کے لایا
- عقیلہ:- تمہارا سسرا وہی جو بھیڑیں کسی زمانے میں ہانکتا تھا
- شکیلہ:- ہماری اماں کو روز چھپ چھپ کے اپنی کھڑکی سے بھاگتا تھا
- شکیلہ:- تمہارا شوہر بھی چھپ کے کھڑکی سے روز بندری کو بھانکتا ہے
- وہ روز کھڑکی کے پاس ہی کیوں بیٹھ بیٹھوں میں ٹانگتا ہے؟
- لگنے تھے کل ہی کھسے جو اُس نے وہ عشقیہ خطاں لپے گیا
- دکھاؤں گی سب کو آج یہ خط پڑھے گا ان کو محسوس سارا
- عقیلہ:- اری بہن!..... آپا..... کیا یہ سچ ہے، میری خطا میں معاف کر دو
- بہن بہن سے لڑی تو کیا ہے جو دل میں ہے میل صاف کر دو
- میں کتنی باتیں سنا ہی تھی زبان خاموش تھی تمہاری
- قسم خدا کی بتاؤں کیسے، ہو تم مجھے جان و دل سی پیاری

تم اپنے گھر میں مجھے بلانا میں چھپ کے دیکھوں کی نظارہ
 جو وہ اشائے کریں گے تم کو ہوا کروں گی میں عشق سارا
 ابھی میں آتی ہوں میری پیاری رد مال میں باندھ کر مٹائی
 خدا مجھے بھی وہ خط پڑھانا کہ جن میں الفتن گئی جتنائی
 تمہارا کتا رادھر جو آٹے نہ رو کو معصوم جانور ہے
 وہاں جو کھائے یہاں بھی کھائے کہ یہ بھی آخر اسی کا گھر ہے
 تمہارا بکلا بھیں ہنسنا تا ہے گھر میں آ کے ہلا کے ڈاڑھی
 میں پیار سے روک دوں گی اس کو اگر وہ میری اٹھائے ساڑھی



جلال زادہ

سو جا ہیبت خاں کے پوتے سو جا چیم دھاڑ خاں
 ترے رونے سے بہت تنگ آ گئی ہے تیری ماں
 مت اکر اچکے سے سو جا، کالے کالے میرے لال
 نوح ڈالوں گی میں ورنہ تیرے لمبے بال
 تو ہے اک ڈاکو کا بیٹا تو نہیں رد میری جان
 سو جا ہیبت خاں کے پوتے سو جا چیم دھاڑ خاں
 دیکھ تیرے سامنے دس من کا جو صندوق ہے
 اس کے پیچھے کار تو سوں سے بھری صندوق ہے
 اس سے آگے کیا کہوں؟ کھلوا نہیں میری زباں
 سو جا ہیبت خاں کے پوتے سو جا چیم دھاڑ خاں

ایک دن کا ذکر ہے روتی تھی میں سوتی نہ تھی

باپ تیرا چپ کرنا تھا میں چپ ہوتی نہ تھی

توڑ ڈالیں اُس نے اک نکتے سے میری پسلیاں

سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا جھیم دھاڑ خاں

جب گھروں میں کودتا ہے وہ کسی دیوار سے

قفل کھل جاتے ہیں ڈر کر اُس کی اک للکار سے

سہم کہ ہر چہ نہ کہتی ہے اجی میں ہوں یہاں!

سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا جھیم دھاڑ خاں

دست بستہ ہو کے موت اُس سے کہے آدابِ عرض

غالی جا با آپ پورے کر رہے ہیں میرے فرض

آپ کو ٹوکوں بھلا یہ مجھ میں ہمت ہے کہاں

سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا جھیم دھاڑ خاں

بچن میں سب شیرِ برائے کے کہیں بعد از سلام

حکم دیجے کس کو پھاڑیں آپ کے ادنیٰ غلام

آپ کے بچے شہنشاہوں کی گردیں بوٹیاں

سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا جھیم دھاڑ خاں

”پھو“ کرے تو چاند کا دیپک بجھا سکتا ہے وہ

”شو“ کرے تو آگ سا گرہ میں لگا سکتا ہے وہ

اُس کو غصہ آئے تو اُلٹی بہادری ندیاں

سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا جھیم دھاڑ خاں

ہاتھیوں کے شوخ بچے بن میں جب سوتے نہیں

اور ریں ریں کر کے جب روتے ہیں چپ ہوتے نہیں

سُن کے اُس کا نام کر دیتے ہیں بند اپنی نغاں

سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا جھیم دھاڑ خاں

زیوروں کی بوریاں اونٹوں پر لے کر آئے گا

آج نوٹوں سے لدے چھکڑے وہ گھر میں لائے گا

میں اکیلی جان اتنے نوٹ رکھوں گی کہاں

سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا جھیم دھاڑ خاں

وہ اٹھی آنکھی وہ سہمے گھر کے سب دیوار و در
 اڑ گئے شاخوں سے کوسے شاید آتا ہے وہ گھر
 پونچھ لے جلدی سے آنسو گر ہے پیاری تجھ کو بیاں
 سو جا ہیبتِ غماں کے پوتے سو جا جیتم دھارِ غماں



جمال زادہ

میرے نئے چاند مت رو میرے شاہزادے سو جا
 تیری جند کہیں اسے ظالم نہ مجھے رُلا دے سو جا
 تیرا باپ میرے گھر سے مجھے درِ غملا کے لایا
 ہوا وصل درِ جہنم جو مجھے بھگا کے لایا
 تھا جمال نام اس کا اسے جمال زادے سو جا
 تیری جند کہیں اسے ظالم نہ مجھے رُلا دے سو جا
 مجھے مومن کو جس نے کیا روزِ جہ سے دنگا
 نہیں اب وہ آنے والا گیا جاگ وہ لنگا
 جسے میں کبھی نہ بھولوں تو اسے بھلا دے سو جا
 تیری جند کہیں اسے ظالم نہ مجھے رُلا دے سو جا

وہ کواڑ بسند کر کے مجھے روز پیٹتا تھا
کبھی مثل چار پائی وہ مجھے گھسیٹتا تھا

تو اگر ہے میرا بیٹا اُسے بد دعا دے سو جا

تیری جند کہیں اے ظالم نہ مجھے رلا دے سو جا

میری چٹیا اُس نے کاٹی میری ٹانگ اُس نے توڑی

میرا کون ہے جہاں میں کہاں جاؤں میں نگوڑی

جو میں کر چکی ہوں اُس کی نہ مجھے سزا دے سو جا

تیری جند کہیں اے ظالم نہ مجھے رلا دے سو جا

وہ جو عاشقی کے دن تھے وہ کبھی کے کٹ چکے ہیں

میرے بک چکے ہیں زبور میرے کپڑے پھٹ چکے ہیں

کہیں میری آہ سوناں نہ تجھے جلا دے سو جا

تیری جند کہیں اے ظالم نہ مجھے رلا دے سو جا

نہ لبوں پہ اب ہے سرخی نہ وہ منہ پہ اب ہے غازہ

لئے جا رہی ہے قسمت میرے عشق کا جنازہ

کہیں حادثہ یہ پاگل نہ مجھے بتا دے سو جا

تیری جند کہیں اے ظالم نہ مجھے رلا دے سو جا

مجھے کون اُسرا دے، میں ہوں شہر میں اکیلی

نہ برا عزیز نہ کوئی، نہ مری کوئی سہیلی

میرے غم کو میرے دکھ کو تو ہی اُسرا دے، سو جا

تیری جند کہیں اے ظالم نہ مجھے رلا دے سو جا

ارے سو، نہیں تو دوں گی تیرے منہ پر ایک تھپڑ

کہیں پھینک دوں گی یاہر، تجھے مار کر دو ہتھڑ

اے سُر کے نیچے مت رو، اے زلزا دے سو جا

تیری جند کہیں اے ظالم، نہ مجھے رلا دے سو جا



چاچا رحیم اللہ

”مجھے روکا ہے کیوں؟ کیا بات ہے چاچا رحیم اللہ؟“
 ”اری یہ پوچھنا کتنا آج کیسا ہے کریم اللہ؟“
 ”کریم اللہ تو کتنا کتنا چچا سے مل کے آیا ہوں“
 ”اری اب بیٹھ بھی تا، آدھر کیا میں پرایا ہوں؟“
 ”چچا جانے دو، زبوتاک میں ہر وقت بہتی ہے“
 ”بہت آتا ہے غصہ تو چچا کیوں مجھ کو کہتی ہے؟“
 ”جو کہتا ہے ذرا جلدی کہو، اب مجھ کو جانا ہے“
 ”تیرے ہونٹوں پہ ظالم ہر گھڑی کوئی بہانا ہے“
 ”اوئی اللہ اتر آئے ہو تم تو باغیا پانی پر“
 ”او ظالم بیٹھ جا بس دو منٹ اس چار پانی پر“

”ارے پھوڑو کلائی تو بہ چوڑی ٹوٹ جائے گی“
 ”میرا منہ بیٹھا کرتی جا۔ کلائی چھوٹ جائے گی“
 ”میں رو دوں گی مجھے پھوڑو، چچی کو جا کے پکڑو“
 ”چچی چوٹھے میں جائے، پیاری بتو مجھ سے اکڑو“
 ”ارے میں مر گئی تو بیچھی وہ آگئی پھوڑو“
 ”گئی ہرنی میاں اب بیٹھ کر تم اپنا دل جوڑو“
 ”انہیں راہوں میں بیٹھا روزِ حُفّہ گر گر آتا ہوں
 سوا اس کے قصہ کے میں سب کچھ بھول جاتا ہوں“



میرے تنکیوں پر لکھے ہوئے اشعار

یہ آرزو ہے کہ سویا رہوں ہزاروں سال

قیامت آئے تو بیگم مجھے جگا دینا

کھا نہ ہمسائی سے میری خلیاں جان بہار

میں نے آنکھیں بند کر لی ہیں، مگر سویا نہیں

نیچے پہ شب کو پانی پھڑک کر میں سو گیا

وہ سمجھیں اک کے بھر میں رو یا تمام رات

پانچ چھ تنکیوں کو پھیلا کر اڑھا دو اک لحاف

بھاگ جاؤ۔ بیویاں سمجھیں گی شوہر گھر میں آئے

کدشش کدوں ہزار نہ آئے گی مجھ کو نیند

تکیہ ہے نرم۔ بیوی کا برتاؤ سخت ہے

خدا یا کون یہ تکیے پہ تیرے بلکھ گیا اگر

”ترا سر سنجہ بالیں ہے۔ تیرا تن بار بستر ہے“

ہمیں ہماری بیویوں سے بچاؤ

پر پل پڑتی ہیں ہم پر، جب بھی ہم دفتر سے آتے ہیں
 ہلاکو خاں سے یا چنگیز خاں سے ان کے ناتے ہیں
 نہ اٹھ کر کھینچا جھلتی ہیں، نہ دیتی ہیں ہمیں پانی
 پسینہ اپنا ہم تو ٹھنڈی آہوں سے سکھاتے ہیں
 انہیں لازم ہے جب ہم آئیں یہ جھک کر قدم چھولیں
 مجازی ہم خدا ہیں پھر بھی ان پر رحم کھاتے ہیں
 اڑا لیتی ہیں سب نقدی تلاشی جیب کی لے کر
 ہم اپنی ہی کمائی ان سے ڈر ڈر کے چھپاتے ہیں
 کچھ انکم ٹیکس لے جاتا ہے، کچھ بیوی اڑاتی ہے
 قسم اللہ کی شوہر بہت دولت کھاتے ہیں

سیلی ان کی آجائے تو سمجھو عید ہے ان کی
 بگڑ جاتی ہیں، جب ہم دوستوں کو گھر بلاتے ہیں
 نہیں جاتیں کبھی باورچی خانے میں یہ بھولے سے
 کھانا ہے بہت آقا، مزے نوکر اڑاتے ہیں
 بہانہ کر کے درپردہ کا اکثر لیٹ جاتی ہیں
 نہ ہو نوکر اگر گھر میں، تو ہم چائے بناتے ہیں
 ہے ان کا کام رونا، پان کھانا یا بگڑ جانا
 گریں کیا بادل ناخواستہ ان کو مناتے ہیں
 خدایا آج کے شوہر ہیں یا معصوم بچتے ہیں
 ذرا سا گھورے بیوی، تو جھٹ یہ سہم جاتے ہیں
 یہ جب روتی ہیں ہم اپنے کلمے تمام لیتے ہیں
 سیاہی چوس لے کر ان کے آنسو ہم سکھاتے ہیں
 حجامت روز کر دیتی ہیں یہ غصے کی قینچی سے
 غنیمت ہے کہ اپنی شیو تو ہم خود بناتے ہیں

آفاق جب مرغ دیتا ہے سمجھتی ہیں یہ لوری ہے

انہیں مرغے سلاتے ہیں، انہیں مرغے جگلاتے ہیں
چلے جاتے ہیں کھا کر روکھی سوکھی اپنے دھڑ کو

بچارے مرد سب رورو کے اپنے دن بیتے ہیں
مردِ شرجیے بھی ہیں شوہر رنجشے جائیں گے

سدا جو بیویوں کے ظلم سہہ کر سکتے ہیں
کبھی آزاد تھے ہم ہائے اس قیدِ غلامی سے
وہ دن کتنے تھے اچھے ہائے وہ دن یاد آتے ہیں



دشکِ نیم شب

کھٹ کھٹا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

اے مری روکھی ہوئی بیوی قدامت سے بول

رات کو دیر سے آنا میری عادت ہی تھی

میرا ہر عیب چھپاتا تیری فطرت ہی تھی

میری راحت کیلئے تھوڑی سی زحمت ہی تھی

حرفِ اُلفت نہ تھی حرفِ ملامت نہ تھی

شیریں آواز کا کافی میں میرے سب رس گھول

کھٹ کھٹا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

شک نہ کر مجھ پہ مری جان سے پیاری ممتاز

پڑھ رہا تھا کسی سجد میں تعبد کی نصیحت

ایک ہی صفت میں کھڑے تھے وہاں مگر دوا یا ز

نہ کوئی بندہ وہاں تھا نہ کوئی بندہ نواز

میرے ہی گھر سے نہ کہہ جائے میرا بستر گول

کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

پھول اک روز تیرے پیار کے توڑے ہیں نے

کھائے والد سے تیرے عشق میں کوڑے ہیں نے

مر مر رہا تیرے پھر بھی نہ چھوڑے ہیں نے

بھر سسرال میں ددڑا دے گھوڑے ہیں نے

اپنے ماضی کی ترانہ میں ذرا مجھ کو تول

کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

”عشرت بیوی ہے شوہر میں فنا ہو جانا

نہ کہ ہر بات میں شوہر سے خفا ہو جانا

یک بیک رحم و مروت کا ہوا ہو جانا

بادر آیا ہمیں بیوی کا جسد ہو جانا

پر خدا کو بھی نہیں بندوں پہ اتنا کنٹرول

کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

تجھ کو میری ہی قسم ختم کر اب تو یہ سوانگ

رات کو کھیل نہ غصے کی یہ پیادہ می پنگ پانگ

اُدنی دیوار سے کودا تو سرک چلے گی ٹانگ

مجھ سے پہلی سی محبت میری لگتا ہے نہ مانگ

اور بھی منکر ہیں بیوی کی محبت کے ہوا

راحتیں اور بھی ہیں بیوی کی راحت کے ہوا

کیسے کر سکتا ہوں دن رات میں محنوں کا رول

کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

”آہ کہ چاہیے اک عسرا شہ ہونے تک“

کھٹ کھٹاتا ہی رہوں گا میں سحر جہنم تک

”دیجیں کیا گزرتے ہے قطرے پہ گھر ہونے تک“

میں بھی جیتا ہوں محنت کو خبر ہو سنہ تک

آج اتر جائے گا شاید میری عزت کا خول

کھٹے کھٹانا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

اچھا جاتا ہوں مجھے دل سے محبت دینا تم

یاد بھی آؤں تو دوا شک بہا لیتا تم

میری تصویر کو سینے سے لگا لیتا تم

ختم راسخ ہو تو بنیے سے مرگ لیتا تم

کچھ ناموس ہوں کہ کیوں تم سے پرہیز دو لول

اب نہیں تم سے کہوں گا کبھی "دروازہ کھول"



مثنوی قمری عشق

(۱)

ایک لڑکا "لڑکیاں" اپنی سدا	گاؤں کے باہر بچایا کرتا تھا
ایک دن سوچی شرارت یہاں سے	ایک لڑکی سے محبت وہ کرے
جڑھ کے ایک ٹیلے پہ چلنے لگا	"عشق آیا عشق آیا دوڑنا"
گاؤں والے سن کے یہ گھبرا گئے	اُس بچارے کی مدد کو آگئے
سب شادی اسکی کر دی ایک سے	بل گیا وہ ان میں سب سے نیک سے
شہر میں ساتھ اپنے اُس گئے گیا	گاؤں کو داغ جڈائی دے گیا
وہ تھی موجِ سن یہ موجِ شباب	چینی کی گڑیا دیا اُس کو خطاب
مست تھے وہ سب دلہن کی چاہ میں	سب کے سب آنکھیں بھاتے راہ میں
رات دن چلو لہانے دی جب اور عشق	ایک لڑپیدا ہوئی اولاد عشق

عظمت اللہ خاں رکھانچے کا نام

ماں کی گودی میں تھا بچہ شاد کام

(۲)

وہ تھا دولہا اور دلہن تھی یہ کینز
بتلی تلی شورخ کو مل اور دینز

کچھ زمانہ خوب خوشیوں میں کٹا
ٹانگ ہی ٹوٹی نہ میرا سر پھٹا

آخر غم بندی سے وہ اکتا گئے
میرے گردش میں تارے آگئے

روز مجھ پر سختیاں ہونے لگیں
مُر مگیں آنکھیں بری ہونے لگیں

چینی کی گڑیا وہ ڈان بن گئی
اُم کی ڈالی بکا بن بن گئی

آج ہنگامہ سا گھر میں ہو گیا
جاگ کر میرا نصیب سو گیا

رکھ کے سب شرم و حیا بالاسطاق

آج اس بندی نے لے لی ہے طلاق

(۳)

صبح یہ کتنی عظیم الشان تھی
چھ تھے وہ اور میں اکیلی جان تھی

ترکے ترکے جب چھڑا گھر میں فساد
میں بھی بولی دل میں ہر چہ بادہ باد

میری نندوں نے مجھے رنڈی کہا
دیوروں نے مجھ کو بگڑنڈی کہا

جلیٹھ جب بولے کہ تو کتے کی دم
میں بچا کہ اتھ بولی ہو گئے تم!

ساس کے زیرِ زنجاراں تھی چھڑی
نرگس آسا تھی وہ آنگن میں کھڑی

گھوڑ کر اس نے کہا مجھ سے کہہ بائیں
بھیر جا لیتی ہوں میں تیری بلایں

پہلے آپٹی وہ آتش کی طرح
بعد میں برسی وہ بارش کی طرح

گالیوں کی ہر طرت بوجھا رہی تھی
اک ذرا گھونگھٹ کی تھوڑی آڑ تھی

دستِ شفقت مجھ پر جب پھرنے لگے
ٹپ ٹپ آنسو آنکھ سے گرنے لگے

جب میرے مے کے لئے تھک گئی
کوئے مٹکاتی وہ بلیٹھک تک گئی

ہانپ کر بولی کہ بیٹا المدد!

لے کے ڈنڈا آگئے عبدالصمد!

مجھ پر وہ ڈنڈا پھرا پھر اس طرح
کاغذی لکڑی پر رندا جس طرح

میری پیٹوں کی جبین شہنائیاں
کھڑکیوں میں لگیں مہائیاں

سب مجاہدین میں کچھ ایسے ڈٹے
چوڑیاں ٹوٹیں مرے کپڑے پھٹے

تھام کر بازو گماتے وہ رہے
جسم کی پھر کی پھرتے وہ رہے

میں نگوڑی ہو گئی جیسا دھوئی فرش پر خوش کھائے اک دم گر پڑی
 ہو گئے وہ چار پائی پر دراز گاڑ دی بندی پر چشم نیم باز
 منہ میں اپنے ٹٹوں کو دیکھنے کی لئے کش لگائے چند آنکھوں نے پے پے
 بڑے مجھ سے اور بھی کچھ سمجھے ہیں یہ بولی ہاں وہ پرزہ دیکھئے

بھٹ آنکھوں نے ہاتھ میں دیدی طلاق

”عظمت اللہ“ بولے ہاں ہاں وہ بھی عاق

(۵)

عارضوں پہ تھپڑوں کی لالیاں مہر میں لاکھوں ملی ہیں گالیاں
 گھر سے دروازے پہ بندی ہو کھڑی اور کئی چٹیا ہے آنکھوں میں پڑی
 منہ اپانی پی کے کچھ تھراس کا آخری بوسہ یا ہے ساس کا
 دیا نگہ یا ٹم ٹم ابھی منگواؤں گی خیر سے بیکے چلی اب جاؤں گی

ساتھ میرے عظمت اللہ خان ہے

لب پہ کل من علیہا خان ہے



ڈرامہ شیریں سراو

مرے دل کی دھڑکن مری شاہزادی فراد :-

مری آنکھوں نے تجھ کو صدا دی

باس حسین تیرا یوں جگ گائے

چمک دیکھ اس کی قسم سہم جائے

گالیاں میں بلبل تیرے گیت گائے

کلی تیرے لب کا تبسم چرائے

تیرے عشق نے آگ مجھ کو لگا دی

مری آنکھوں نے تجھ کو صدا دی

یہ جی چاہتا ہے کہ اب مسکرائے شیریں :-

منج دوں یہ میرے یہ موتی اٹھائے

میں دل میں چراغِ محبت جلا کے

رہوں گی ترے ساتھ گٹیا میں آگے

اگرچہ ہوں محلوں میں رہنکی عادی

مری آرزوؤں نے تجھ کو صدا دی

ایکڑا پیلا تیرا۔۔۔ ری ہرسل ہوئی ختم سینہ دکارو!

یہ ہمیرے یہ موتی یہ کپڑے اتارو

وہی پھیر غوی وہی نامراد!

تیریں:-۔۔۔ مرے آگے اُلفت کا دامن نہ پھیلا

ری ہرسل ہوئی ختم چل میرے پھیلا

پہن گزے نوزے اٹھا کوٹ مھیلا

یہ لے اپنی بٹری یہ لے اپنا تھیلا

پٹخ دے یہ نخل پہن لے یہ کھادی

ایکڑا پیلا تیرا:-۔۔۔ یہ فی الحال تم دو روپے لے کے جاؤ

رسید اس رقم کی ابھی دے کے جاؤ

بہت چار سو بیس کے تم ہو عادی!

تیریں:-۔۔۔ چلو دو روپے لے کے اب مسکرائیں

فراد:-۔۔۔ بہت دلو سے بھوکے ہیں راشن منگائیں

تیریں:-۔۔۔ جو ٹھنڈے پڑے ہیں وہ چھلے جلائیں

فراد:-۔۔۔ ”محبت کے یہ گیت“ چو لھوں میں جائیں

کہ خاقان نے بنیادِ اُلفت ہلا دی



پھر ہم نے لیں آنکھیں کھول

مانگے کی کتابیں — واپسی پر

”کلام حالی“ پہ گھی کی تھالی رکھی رہی تھی، معاف کیجئے
 پھر اس پہ اک دن دوات پیری اُلٹ گئی تھی، معاف کیجئے
 ”کلام داغ“ آہ کھٹے چونے کے پیالے داغوں کو بھر گیا ہے
 ادب اس میں سے اک حسیں غزل میں نے پھاڑ لی تھی، معاف کیجئے
 ”کلام غالب“ پہ غالب آئی تھی میرے بچوں کی برقمیزی
 ورق ورق ہو کے ہر غزل میں بٹ گئی تھی، معاف کیجئے
 ”کلام آزاد“ جلد سے اپنی آواز اد ہو گیا ہے
 کہ اس پہ ننروں میں چھینا بھٹی سی ہو گئی تھی، معاف کیجئے
 ”کلام آتش“ باورچی خانے میں لے گئی تھی میری پڑوسن
 ہر ورق پر حساب بننے کا لکھ گئی تھی، معاف کیجئے

”فسانہ میوہ ذرا کھیر گئی تھی، نہ آہیں بھر دیے
 وہ کھیر جھٹ میں نے اپنے دامن سے پونچھ دی تھی، معاف کیجئے
 ”انیس کے مٹھوں“ پہ آنسو میرے گرے تو ورق پیسے
 رگا کے آنکھوں سے ان کو شاید میں دم پڑی تھی، معاف کیجئے
 وہ بال جبریل“ کھو گئی لے گئے ہیں شاید اُسے فرشتے
 سنبھال کدورنہ طاق نسیاں میں یہ رکھی تھی، معاف کیجئے
 ”کلام اکبر کو میرے اصغر نے چار آنے میں بیچ ڈالا
 زیادہ پیسے نہیں ملے چونکہ پھٹ گئی تھی، معاف کیجئے
 وہ ”شعلہ و شبنم“ ایک مزدور مجھ سے یہ کہہ کے لے گیا تھا
 کہ بوش نے یہ کتاب میرے لئے لکھی تھی، معاف کیجئے
 ”ہمارا اختر“ کو میرا اختر نہ پھینک آیا ہو واویلوں میں
 کتاب یہ اُس نے منہ سلی سے چپیں لی تھی، معاف کیجئے
 وہ ”نقش فریادی“ رُوس چل دی کہ رُوس اُس کو پسند آیا
 ہمارے گھر میں بہت ترقی نہ کر سکی تھی، معاف کیجئے

کتاب راشد تو تانیوں کی تلاش میں آج گھر سے چل دی
 میں کیا کہوں یہ بہت ہی آزاد ہو گئی تھی، معاف کیجے
 کلام چرکیں؟ یہ ایک دھبہ نہیں لگایا ہے دیکھ لیجے
 کتاب یہ آج ہم نے کر کے وضو پڑھی تھی، معاف کیجے
 بہت حفاظت سے لائی ہوں یہ کتابیں اپنی سنبھال لیجے
 میں پڑھ چکی "تعلیم" نثر الماریوں سے مجھ کو نکال دیجے



دو حرام زانے

پہلا شرابی:- زمانہ گردش میں جھومتا ہے نشے نگاہوں کو آگے ہیں
 وہ ہاتھ زندہ رہیں خدایا جو مجھ کو دھمکی پلا رہے ہیں
 دوسرا شرابی:- جناب کیا آپ ہوش میں ہیں؟ اگر ہے ایسا تو ادھر لیجے
 شراب خانے میں آئے ہیں تو خودی کو غرق شراب کیجے
 پہلا شرابی:- نشہ بہت ہو گیا ہے صاحب نہ اور دیکھ شراب مجھ کو
 کہ اک بڑا سانپ لگ رہا ہے یہ ملتا ملتا کباب مجھ کو
 دوسرا شرابی:- کباب تو بہترین ملتے ہیں شام کو میرے گھر کے آگے
 اور اتنے خستہ کہ ٹوٹ جائیں اگر نہ پیٹے ہوں ان پہ دھاگے
 پہلا شرابی:- پتہ جناب اپنے گھر کا اس خاکسار کو بھی بتائیے گا
 یہ کارڈ میرا ہے بھائی صاحب! ضرور تشریف لائیے گا

پہلا شرابی:- اٹھو نمبر، نظام منزل، یہ میرے گھر کا پتہ ہے صاحب!
 دوسرا شرابی:- مگادوں ٹیکسی؟ بہت نشہ آپ کو اگر ہو گیا ہے صاحب!
 پہلا شرابی:- نشے میں کوئی بھی اپنے گھر کا پتہ نہیں بھولتا ہے مسٹر
 دوسرا شرابی:- بہت سی پی لے تو ماں ہیں تاکہ بے یقین بھولتا ہے مسٹر
 پہلا شرابی:- میرے کرتم یقین کرلو۔ بہک گئے ہو نشے میں گم ہو
 دوسرا شرابی:- تو گویا طلعت کے نام پر جو مکاں ہے اُسکے یکن تم ہو
 پہلا شرابی:- قسم خدا کی اٹھارہ نمبر نظام منزل، میرا مکاں ہے
 دوسرا شرابی:- کرا یہ دیتی ہے اس کا طلعت تو کہہ رہا ہے تیرا مکاں ہے
 پہلا شرابی:- نشے میں کہتا ہوں صاف تجھ سے بہت طلعت کو پیار مجھ کو
 دوسرا شرابی:- زبان کو دے لگام ورنہ تو آج کھائے گا مار مجھ سے
 پہلا شرابی:- جو ہاتھ مجھ پر کبھی اٹھایا طلاق لے لے گی تجھ سے طلعت
 دوسرا شرابی:- وہ تجھ کو سینڈل سے پیٹ دے گی کہ عشق کرتی ہے تجھ سے
 پہلا شرابی:- اگر تجھی سے وہ عشق کرتی، گلے لگاتی نہ وہ مجھے بھی
 دوسرا شرابی:- ابھی جہنم میں بھیجتا ہوں تیرے نشے کو بھی اور تجھے بھی

پہلا شرابی:- گلا پر گھٹا ہٹا لے اپنے، یہ ہاتھ گڈے، یہ کالے کالے
 دوسرا شرابی:- تباہ کر دوں گا۔ مار ڈالوں گا میں نہ پھوڑوں گا تجھ کو سارے
 پہلا شرابی:- اٹھارہ نمبر نظام منزل میں بول بیٹا کبھی گھٹے گا؟
 دوسرا شرابی:- تمہاری ماں کو گلے لگانے تمہارا یہ باپ ابھی گھٹے گا
 پہلا شرابی:- کیبنے کتے دپھٹے گریباں، رذیل پاچی دپھٹی وہ ڈائی
 دوسرا شرابی:- سٹور کے نیچے دگلاس ٹوٹے، حرام زادے! اگر تپائی
 شراب پتھر، کھٹاک گھونٹے دھرم بھرم دھاپ چلے ہیں
 گلے پھلا کے دھیں اٹھا کے یہ دونوں مرنے اچھلے ہیں
 تیسرا شرابی:- حیں ہے موسم، سماں ہے رنگیں، لڑو نہیں بھائی باز آؤ
 ارے او بیرو یہ کیا ہے گڈ بڑ؟ یہ مرنے جائیں انہیں چھڑاؤ
 بیڑا:- جناب یہ دونوں باپ بیٹے ہیں، بھولی جاتے ہیں دڑپ کے
 یہ دونوں رہتے ہیں ایک ہی گھر میں غل مچاتے ہیں دڑپ کے
 تیسرا شرابی:- اچی وہ طلعت کا کیا ہے قصہ؟ جو ہو گئی زیب داستان ہے
 بیڑا:- اچی وہ ہے ایک نیک عورت جو اس کی بیوی اور اس کی ماں



بورڈ آف انٹرویو

کُتا کیوں اپنی دم دباتا ہے؟
 کتنے میں ایک بندر آتا ہے؟
 آسمان پر ستارے کتنے ہیں؟
 شہر میں غم کے مائے کتنے ہیں؟
 تھوڑی پوری میں کتنے مالی ہیں؟
 شہر میں کئے مکان خالی ہیں؟
 آج کیا بھاؤ ہے بتا شے کا؟
 کیٹس کا وزن کتنے ماشے تھا؟
 لائٹ فیلو کی کتنی ٹانگیں تھیں؟
 صبحِ رُخنے نے کتنی بانگیں دیں؟

اُردو ناول میں کیا جھکاؤ ہے؟
 کیوں نئی شاعری میں تاؤ ہے؟
 شاعری کے ہیں کتنے امکانات؟
 اس پر قلبیوں کے کیا ہیں احسانات؟
 ذوق کتنے روپے کماتا تھا؟
 اپنی بیوی سے کیوں چھپاتا تھا؟
 مرزا غالب کے کتنے بچے تھے؟
 کتنے جھوٹے تھے؟ کتنے سچے تھے؟
 آ کے محمود سترہ حملوں میں؟
 کون شے لے گیا تھا گملوں میں؟
 کچھ کہو آلوؤں کے بالے میں
 کچھ کہو بجالوؤں کے بالے میں
 کیوں ہمیں دیکھ کر ہو تم گم سم؟
 آؤؤں سے کبھی ملے ہو تم؟



مریدان باصفا

(۱)

یہاں سے پیر صاحب اب نہ جانا
خدا را یہ رستم ہم پر نہ ڈھانا

مسلمان تم ہو ہم بے دین کافر
تمہیں اول ہمارے تم ہی آخر

بہت ہی دور ہیں اسلام سے ہم
نہیں مانوس ابھی اس نام سے ہم

سمجھ لو کافر سب کی یہ بستی
یہاں تم سی نہیں ہے کوئی بستی

سلاش پیر میں غمگین تھے ہم

بہت ملحد، بہت بے دین تھے ہم

بہت سے راستے تم نے دکھائے

بہت پتھر تھے رستے سے ہٹائے

یہاں اب ایک بڑی مسجد بنانا

نمازیں رات دن ہم کو پڑھانا

نہ جانا بھاگ ہم سے تلنگ کے
تمہیں پالیں گے ہم دینے کھلا کے

پلائیں گے تمہیں صبح بادل

کھلائیں گے تمہیں آخر ڈھیر شام

تمہیں ہم دیں گے بے بے چاقو

پلائیں گے تمہیں کروا تمباکو

پورس کے دم تمہیں لگوائیں گے ہم

کبھی تم سے تمہیں لگائیں گے ہم

نہیں اب دیوی بچوں کو کہو یاد

سبھی نیکروں سے اب ہو جاؤ آزاد

کہو تو آج بیڑا پار کر دیں

تمہاری شادیاں ہم چار کر دیں

بہت ہو تم اگر بچوں کے شیدا

یہاں بھی تو وہ ہو سکتے ہیں پیدا

(۲)

بہت عرصے سے تم گھبراہے تھے

وطن کو چوری چوری جا رہے تھے

پکڑ کر مار ڈالا آج ہم نے

شہادت کا پہنایا تلج ہم نے

کئے ہم نے تمہارے پانچ ٹکڑے

تمہارے کردے سب دُور دکھڑے

ابھی تم کو کفن پہنائیں گے ہم

بہت روئیں گے جب دفنائیں گے ہم

دلوں میں ہوک لب پہ آہ ہوگی

تمہاری اک حبیں درگاہ ہوگی

سراٹنے اک دیا جلتا رہے گا

دروہ اور فنا تخر جلتا رہے گا

کہیں گے ہم تمہارا عرس ہر سال

مُریوں کو دہاں پر آئے گا حال

سب آئیں گے تمہاری لے کے یادیں

بلیں گی تم سے ہم سب کو مرادیں

یہ چہرہ اور یہ ریش پُر انوار

دکھائی دے رہے ہیں آخری بار

چلو اب پیر کو گودی میں لے لو

لحد کی گودی میں اس کو دھکیلو

کسی کا خاک میں ملنا جوانی دیکھتے جاؤ
 بہا کے اٹک اس کی لاش فانی دیکھتے جاؤ
 بہت یہ وعظ کرتا تھا گر یہ اب بے لڑے گا
 کفن سر کاؤ اس کا بے زبانی دیکھتے جاؤ

مالِ سوزِ غم ہائے نہانی گم نہ دیکھا ہو
 مالِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ



سُورِوں کی بغاوت

(۱)

جاؤ یہ اعلان کر دو آج باجے بسینڈ سے
 اپنے بستر گول ہم کہیں گے کل انگلینڈ سے
 بچہ بچہ بوڑھا بوڑھا دشمن جاں ہے یہاں
 ہم دہاں آباد ہیں ہر سمت ہیں مودی جہاں
 پالتے ہیں موٹا کرتے ہیں۔ بہت کرتے ہیں پیار
 پھیرتے ہیں دستِ شفقت ہم پہ آکر بار بار
 بوسے لیتے ہیں۔ ہمیں صابن سے نہلاتے ہیں یہ
 بعد میں اک دن پکا کر ہم کو کھا جاتے ہیں یہ

ہم نے صدیوں ہی سہی ہیں سختیاں انگریز کی

نکڑے نکڑے ہو کے ہم زمینت بنے ہریز کی

کانٹوں اور پھریوں سے ہم کو منہ ہیں جلتے ہے

ہم کو کھا کھا کر یہ اپنا راج پھیلاتے رہے

کریم بن کر ان کی ہر عورت کے گالوں میں ہیں ہم

برمش بن بن کر پھرے ہر مرد کے بالوں میں ہم

اپنی دم کے بال لے کر شیو یہ کرتے رہے

اپنی دم تک سے بھی بس بی ہیو یہ کرتے رہے

برمش دانتوں کا بنا کر منہ میں لے جاتے ہیں یہ

اور جانے اب کہاں تک ہم کو پہنچاتے ہیں یہ

اس قدر ان کی طبیعت ہم پہ مائل ہو گئی

اپنی چربی ان کی چربی تک میں شامل ہو گئی

چھپکے ہر اک چیز میں چپکے سے گھس جاتے ہیں ہم

ان کے ہر شعبے میں ہر ماہ میں نظر آتے ہیں ہم

اک طرف دشمن خدا ہے اک طرف انگریز ہے

ہم سے دونوں کا رویہ اشتعال انگیز ہے

ایک پل مت سوچو اب ایک پل مت لیٹیو

باندھ لو رخت سفر اسے ماؤ، بہنو، بیٹیو!

آؤ ہم اس دلیس کو چل دیں مسلمان ہوں جہاں

آؤ اب اس قوم کے جا کر بنیں ہم یہاں

رہیے داں جا کر جہاں میلوں تک عیسائی نہ ہو

جان دینے کی مصیبت قوم پر آئی نہ ہو،

(۲)

دو برس سے جنگوں میں پھر رہے ہیں ہم اُداس

کیا کریں کوئی پھٹکتا تک نہیں ہے اپنے پاس

دور سے آتی ہے کانوں میں صدائے "آخ تھو"

خوب روتے ہیں کلیجہ بھگام کر "میں اور تو"

ملک اپنا چھوڑنے کا آج یہ ریزلٹ ہے

ہر طرف ذلت ہے اپنی ہر طرف انسلٹ ہے

اس قدر تو ہیں اپنی قوم کی ہوگی کہاں

ہم یہ سنتے ہیں "سور کا بچہ" گالی ہے یہاں

وہ جو میخانوں میں چھپ چھپ کر چڑھتے ہیں شراب

مے تو پی لیتے ہیں وہ کھاتے نہیں اپنے کباب

ہم غریبوں کو بھی وہ حقوڑا سا چکھ کر دیکھتے

ایک ٹکڑہ میم کا منہ میں تو رکھ کر دیکھتے،

گھر شرابی لوگ کھا لیتے کبھی اپنے کباب

ہے یقیناً ہم کو وہ نالی میں بہا دیتے شراب

اے خدا آخر بتا کس کام کے ہیں ہم غریب؟

سامنے ہیں ہم مگر کھاتے نہیں یہ بدنصیب

رحم کھاؤ ہم پہ بابا - ہم نہیں اتنے بُرے

یہ ہر تسلیم خم ہے آؤ لے لے کر پھرے

یہ نہیں آئیں گے - کہہ دو آج یا جے بینڈ سے

"ہم بہت پختہ رہے ہیں آئے کیوں انگلیںڈ سے"

اس سے تو اچھا ہے - ہم سب موت عزت کی مریں

پھوڑ دیں یہ ملک اور انگلیںڈ ہم واپس چلیں

ایک پل مت سوئیو، اب ایک پل مت لیٹیو

باندھ لو رختِ سفر اے ماؤ، بہنو، بیٹیو!

جب وہاں جائیں گے ہم کو بار پہنائیں گے وہ

کاٹ ہی دیں گے تو ہم کو بیار سے کھائیں گے وہ

رہیں کیوں اُس جاہاں بیلوں تک عیسائی نہ ہو

بن کے دلہن گھریں کوئی میم تک آئی نہ ہو



مثنوی تاج دین معراج دین

(۱)

میں لکھنے سے پہلے یہ کرتا ہوں طے
یہ انیس سو تیس کا ذکر ہے
یہاں سے میں پہنچا ہوں لاہور میں
سمجھ لیجے انگریز کے دور میں
میں ہوں اور پنجاب کے زندہ دل
وہ رشتہ چہرے وہ تابندہ دل
وہ گھر سے نکل آیا بازار میں
سمجھ لیجے کوٹ اور شلوار میں

کمرہ ان نظاروں کباب میں بیاں

جو اُس دور میں میں نے دیکھے نہاں

(۲)

خوشی ہی خوشی ہے جاہر دیکھئے
ذرا مسکرا کر ادھر دیکھئے
وہ سڑکوں پہ پنجابی منڈے چلے
کسی نے کہا دیکھو غنڈے چلے
جھکی ایسی پگڑی ہے اک آنکھ پر
پڑے گر کسی پہ تو ترچھی نظر
یہ تہ بند پر بوسکی کی قمیض
جو دیکھے تو غش کھلے دل کا مریض
یہ دیں اس طرح اپنی مونچھوں پہ تاؤ
کہ رستم بھی اُجھے تو بولیں کہ "اؤا"

اکڑ کر چلے کیوں نہ ہر نوجواں
 ہے قینچی کا سگرٹ بنوک زباں
 بڑے فزے کش لگاتے چلے
 دھوئیں پر دھواں یہ اڑاتے چلے
 اذاکہ رہی ہے کہ ہم شیریں
 ہر اک سامنے اپنے بکری کی میں
 طبیعت کے فطرت کے رنگین ہیں
 یہ "کاچو" چلانے کے شوقین ہیں
 نہیں کوئی غم خوش رہیں یہ مدام
 فساد اور دنگے کریں صبح و شام
 جسے چاہیں رستے میں کندھا دکھائیں
 وہ "چوں" بھی کرے تو ابھڑا سس جائیں
 کہیں کیوں بے گالی کسے تونے دی؟
 نکالوں ابھی تیری "فوں" اور "نی"؟

یہ منٹوں میں بس دھن کے رکھ دیں اُسے
 ہزاروں میں یہ چین کے رکھ دیں اُسے
 یہ سمجھو نہیں پھر بچارے کی خیر
 قیامت تک اُس کو رکھیں گے بے
 ہیں مشوران کے لب "خوش کلام"
 کہیں لوگ ڈر ڈر کے جان کو سلام
 ادب سے کہے جو انہیں "پنلو" آ
 رہے عورت اُس کی بچے اُسکی جان
 یہ بھر پور سینہ یہ اٹھتا شباب
 کہیں کھائینگے چاکے نان اور کباب
 "کہا اگر کسی نے کہ کچھ کھائیے
 کہا خیر بہتر ہے منگو ایسے"
 نہیں چومتے ان کے لب جام کو
 کہ پیتے ہیں فالودہ یہ شام کو

کھدے بازوؤں پر ہیں یاروں کے نام
ہراک ان میں ہے عاشقی کا امام

بہت اونچا عورت کا بھلیں مقام
یہ کرتے ہیں اس صنف کا احترام

یہ ہیں تلج و معراج و تہاب علی

اکھاڑوں میں ان کی جوانی پئی
پیہ ان کے جسموں نے مسوں کا تیل

پڑھی ان کے قد پر جوانی کی بیل
بنے جسم فولاد ڈنڈے پر پیل کہ

گزاریں یہ ہر شام ہنس کھیل کہ
نہ دل ہیں یہ لائیں غم خوب زشت

یہ دنیا ہی ان کے لئے ہے بہشت

بظاہر تو برطانیہ کا ہے راج

مگر اصل میں ان کے سر پہ ہے تاج



اشنان

پیل کے اک پیڑ کے نیچے

منگتا میلے کپڑے رکھ کے

اپنی ناک چھسکتا آیا

اور پھر گنگا جہل میں نہایا

گدے منہ سے اگل کے منتر

کرنے لگا وہ جسم پوتر

پاپ اپنے جب دھو گیا منگتا

بھر کہ آہ یہ بولی گنگا

یہ کیا کر دیا تو نے آکر۔؟

اب میں کہاں نہاؤں جا کر؟

آسماں کا بُلبُلہ

اس پر بہت ہنستا ہوں میں
میرے خدا سُن تو ذرا
یہ آسماں کا بُلبُلہ
کیوں تو نے ہم پر رکھ دیا؟



گلاہ پوش

ویران تھا صحرا خاموش تھا دریا
دیا کے کنارے سردی سے ٹھٹھرتا
اک اوڑھ کے ٹوپی چپ چاپ تھا بیٹھا
کمری کی لئے ٹیک
کالا سا پہاڑ ایک

بُہت بڑا آنسو

کس کی آنکھوں سے گرا ہے؟
یہ سمندر! — یہ بڑا سا آنسو

ایک چہلم

(۱)

جیہا آب اٹھو نہ آنسو بہاؤ نہیں وقت رونے کا دریاں بچاؤ
یہ دنیا ہے فانی، گیا جانے والا وہ رونے سے واپس نہیں آنے والا
نہ بیکار آب تم دھائی مچاؤ اٹھو سارے گھر میں صفائی کراؤ
گو کہ صاف کمروں کے جا لے ذکیہ تو چھت سے بڑا بانس اٹھا لا رضیہ
چھپا کر کہیں رکھ دے میلی رضائی بنائے گی باتیں شفاعت کی تائی
کہ یہ صاف بل جل کے آنگن کو آؤ خدا کے لئے تاک گھر کی بچاؤ
ذکیہ کی ماں تیج پستہ منگانا کریم دین کو دے کے سائیکل بھگانا
مچائی ہے باورچیوں نے دہائی نہیں گوشت لایا مجیدہ و تصائی
ورق یہ ہیں نقلی یہ چاول ہیں گھٹیا انہیں جلد واپس کر آؤ کی پٹیا

معزز معزز جو آئیں گے مہماں بہت تاک آفہ بھوں چڑھائیں گے اماں
خدا کے لئے جلد حقے منگاؤ میاں بھاگ کر چائے پیٹن کی لاؤ
جو مرد آ کے اظہار ماتم کریں گے وہ بیٹھک میں دوس گے چائے پیٹیں گے
وہ حقے ابھی گڑ گڑائیں گے آکر وہ آہیں فلک پر اڑائیں گے آکر

ستائیں گے "مرحوم" کے دہانے
کہ لب بولنے کو دے ہیں خدا نے

(۲)

دوس نے اتار نہ تھا سُرخ جوڑا کہ دو لہانے دنیا لے فانی کو چھوڑا
بہت خوبصورت بہت نیا تھا وہ ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ
نماز اک بھی ہرگز نہ اُس نے تضاکی شب روز کرتا عبادت خدا کی
جدھر دیکھتے ہیں ادھر غم ہی غم ہے کریں اس کا جتنا بھی ماتم وہ کم ہے

دیکھیں پیار سے مجھ کو کتنا تھا خالا بہت تھا وہ سیدھا بہت بھولا بھالا
جدائی میں اس کی ہوا دل دیوانا کہ لگتا ہے اچھا نہ پینا نہ کھانا

ہمارے محلے میں وہ جب بھی آتا خدا کی قسم ہم سے وہ بل کے جاتا
جگر کا وہ ٹکڑا تھا آنکھوں کا تارا ہمیں اپنی اولاد سے بھی تھا پیارا

”نہ رورو کے بے حال ہوائے دلن تو نہ کر اس قدر آہ رنج و محن تو
وہ جنت میں خوشیاں منا لگا مت رو وہ حوروں سے بدل لگا لگا مت رو“

”جیلہ خدا کی قسم مسکرا دے تیری بے قراری نہ ہم کو رلا دے
وہ آخر ہمیں بھی تو تھا جاں سے پیارا مگر دے لیا ہم نے دل کو سہارا“

”نہ کر میں اتنے نہ رونا پیاری

ہمارے کلیجے پہ چلتی ہے آری

(۳)

رضیہ ذرا گرم چاول تو لانا ذکیہ ذرا ٹھنڈا پانی پلانا
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ

”جمیلہ مجھے روغنی نان دینا وہ فرنی اکٹانا وہ پکوان دینا
جدائی میں اس کی ہوا دل دیوانا کہ لگتا ہے اچھا نہ پینا نہ کھانا“

”منگاتا پلاؤ ذرا اور خالہ بڑھانا ذرا قورمے کا پیالہ
جدھر دیکھتے ہیں ادھر غم ہی غم ہے کہیں اس کا جتنا بھی ماتم وہ کم ہے“

یہ نفی کے زردے میں کٹمٹس ہے تھوڑی بہت دیر سے مانگتی ہے نگوڑی
وہ ٹکڑا جگر کا تھا آنکھوں کا تارا ہمیں اپنی اولاد سے بھی تھا پیارا

”پڑا ہے پلاؤ میں گھی ڈال دے کا خا تو ہی حافظ ہے میرے گلے کا
دلہن سے کہو آہ اتنی نہ رو دے بیچاری نہ بیکار ہیں جان کھوئے“

”اری بوٹیاں تین سالن میں تیرے یہ چھپڑا لکھا تھا مقدّر میں میرے
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ

”وہن گھر میں چورن اگر ہے تو لانا نہیں تو ذرا کھاری بوتل منگانا
بہت ہی مزیدار تھا تیرا کھانا بڑھا کر ذرا ہاتھ مجھ کو اٹھانا“

”نہ کہہ بین اتنے نہ روتا تھا پیاری
ہمارے کلبجے پہ چلتی ہے آری“



پارسین

”ہنا سنگا گلہ پڑھا“

”لا الہ... آگے بڑھا“

”آگے آپ بتا دیجے“

”میری جان بچا لیجے“

”آگے مجھے اگر آتا“

”تم سے میں کیوں پڑھواتا“

”سوچ نہ اب بیکار رحیم“

”مار اس کو تلوار رحیم“

”دوہوں اس کے سب کھڑے“

”کھڑے اس کے دو کھڑے“

جنت میں بے چین رہتے تھے ورنہ میں آرام کیا

پیر اور مرید

(۱)

کھٹ کھٹ کھٹ!

در پر کھڑا ہے کیسے، آپ کا دیوانا
جنت کا دروازہ کھولے مولانا

چاند ہے، آدھی رات حیس ہے
دیکھنے والا کوئی نہیں ہے

لایا ہے اک "چیمہ" مرید مستانا

جنت کا دروازہ کھولے مولانا

شیطان کے داد چلا کے

لایا ہوں اک حور بھگا کے

رکھ لیجے آغوش میں میرا نذرانہ

جنت کا دروازہ کھولے مولانا

توبہ کتنی دیر لگائی!

ہاں ہاں میں شیطان ہوں بھائی!

آپ کی شمع رُخ کا پرانا پروانہ!

جنت کا دروازہ کھولے مولانا

چل دوں گا میں پیر دبا کے

آپ کو میٹھی نیند سلا کے

چھلک نہ جائے میرے صبر کا پیمانہ

جنت کا دروازہ کھولے مولانا



اجی پہلے آپ

اجی رکھیے جنت کے در میں قدم!

”اجی پہلے آپ!“

اجی واہ پہلے نہ جائیں گے ہم

”بھئی پہلے آپ!“

اجی بات اس میں تکلف کی کیا

شَدوم مبارک بڑھائیں خدا

اجی چلئے۔ رک جائے گی سب جگہ

”اجی پہلے آپ!“

”بھئی پہلے آپ!“

اجی بڑھ بھی چکے خدا کے لئے

بس اب تو جنت میں ہیں جا چکے

”تکلف کو اب ہر طرف کیجئے

نہ اب مجھ سے کہیے خدا کے لئے

”اجی پہلے آپ!“

عنایت ہے، شفقت ہے یہ آپ کی!

مگر مجھ سے یہ تو نہ ہو گا کبھی!

تکلف کی اللہ حسد ہے کوئی!

یہیں پر کھڑے ہو گئی اک صدی!

”بس اب پہلے آپ!“

”اجی پہلے آپ!“

”ارے ہو گیا بند جنت کا در

خدا یا بت جائیں اب ہم کدھر؟

نہیں واپسی کے سوا کچھ مفسد

چلو بھائی واپس چلیں اب مگر

”ذرا پہلے آپ!“

”اجی پہلے آپ!“

اُونگھ

جنت کے پیارے جنگل میں ٹھنڈی ہوا میں جھوم رہی تھیں
رنگ برنگ پتھریاں پہنے حواریں ہر سو گھوم رہی تھیں

نیلی دھوپ میں استادہ تھے جنت کی مسجد کے منارے
گنبد پر پہ واہ کٹاں تھے ننھے ننھے پمچی پیارے

چوڑن کے اک پر کے نیچے دودھ کی جھیل کے پاس اک کلا
علوے کے اک ڈھیر کے اوپر سر کو جھکائے اُونگھ رہا تھا،



میں اور شیطان دیکھ رہے تھے

جنت کی دیوار پہ چڑھ کر میں اور شیطان دیکھ رہے تھے
جو نہ کبھی ہم نے دیکھا تھا ہو کر حیراں دیکھ رہے تھے

وادی جنت کے باغوں میں اک توبہ اک حشر ہوا تھا
شیطان کے ہونٹوں پہ منسی تھی میرا کلیجہ کانپ رہا تھا

میں نہ کبھی بچوں کا توبہ میں نے دیکھا ہو لپٹا را
”لعنت! لعنت!“ بول رہا تھا جنت کا ہر منظر پیارا

موٹی موٹی توندوں والے بد صورت بد ہیئت ملا

خوف زدہ حوروں کے پیچھے بھاگ رہے تھے کہہ کے بابا!

بچ کے کہاں جاؤ گی؟ کہہ کے وہ دیوانے تپتے گاتے
چارہ طرف سے گھیر کے اُن کو ہنستے، کدکتے، شور مچاتے

ڈر کے چمچیں مار رہی تھیں حویریں ریشمی ساڑھیوں والی
اُن کے دل دھک دھک مارتے تھے دیکھ کے شکلیں ڈاڑھیوں والی

میں اور شیطان لب پر دعا تھے "اے اللہ بچانا اِن کو
اپنے رحمت کے پر سے میں اے معبود چھپانا اِن کو



جہنم میں غنڈے

فشتوں نے جب مجھ کو دوزخ میں پھینکا ڈسا مجھ کو اک سانپ نے پہلے آکر
پھراک کالے بچھو نے "ٹھگی" میری سی پھراک بھڑنے کاٹا مجھے مسکرا کر

جہنم کے ہلکے ہوئے بایلوں نے مجھے دیکھ کر قہقہے خوب مارے
پڑیلوں کے دادا یہ بھگتنوں کے نانا لگے کہنے "کیسی طبیعت ہے پیارے؟"

بھو میں تن گیش میری غصے کے مارے کیا میری فطرت نے مجھ کو اشارا
جہنم کے ایک ایک باسی کو میں نے وہیں پر پچھاڑا، وہیں خوب مارا،

اُٹھائی وہاں میں نے اسی قیامت جہنم کے باسی جہنم سے بھاگے

میں لوہے کا لٹھرے کے تھاپے پیچھے وہ اکھڑے قدم سے تھے اگے اگے

گئیں ٹوٹ اُن نامرادوں کی کمری بہت اُن کی آنکھوں نے آنسو بہائے
ہر اک کہہ رہا تھا بچاؤ بچاؤ ارے مر گئے مر گئے ہائے ہائے!

جہنم کے لوگوں کی دیکھی یہ حالت تو شانِ کربھی کو رحم اُن پہ آیا
نکا لونکا لوہے جلد باہر! یہ کہہ کر جہنم سے مجھ کو بھگایا

”چلو یا رمنٹو چلو کرشن چندر! یہ کہہ کر وہاں سے ہوا میں روانہ
ہمیں دُور سے کہہ رہا تھا اٹھ اٹھ! ہر شام جنت کا موسم ہر سنا



جب شام جنت میں ہوئی

جب شام جنت میں ہوئی

باغوں میں ہر سو گھوم کر

حدیں مری گھر آگئیں

چوہا ہر اک کا میں نے منہ

چمکار کر کے پکار کر

میں نے نہیں بھٹلایا

پہ جب گنا میں نے انہیں

جو سب سے پیاری اُن میں تھی

تھی وہ ہی گم

رہتا تھا گھر کے پاس ہی

کافر ادا اک مولوی
میں نے گرج کر یہ کہا
اُس سے کہ "ادملوں ادھر
آؤ ذرا

سچ سچ بتا کیا بات ہے؟
وسنہ دلو چوں گاترا مٹا گلا



جنت میں حسینوں کی بھوکھڑاں

(۱)

واردۂ جنت۔

اے بہت سی خوب صورت عورتو اس طرح جنت میں آہیں مت بھرو
مر لفتاؤ گرنہ کچھ کھاؤ گی تم ایک دن جنت میں مرجاؤ گی تم
کس کی یاد آتی ہے تم روتی ہو کیوں؟ مات کو کانٹوں پہ تم سوتی ہو کیوں؟
آنسوؤں سے تم ہوئے کتنے رومال یاس سے کٹا گئے ہیں سسہ گال
جو تمہیں تکلیف ہے مجھ سے کہو وادی جنت میں بھوک کی مت رہو
صفت بہ صفت دیکھو یہ بڑی کے پہاڑ ان کو کھاؤ لے کے تم گھونگٹ کی آڑ
جگ گائیں ان پہ چاندی کے ورق ہم نے پھڑکے ان پہ پھولوں کے عرق
دودھ کی جھیلوں پہ بالائی بھی ہے کھوئے کی بطخوں پہ رعنائی بھی ہے

سیر کر لے کے اک مصری کی ناؤ
میسٹی میسٹی ہے ہوا جنت کی اکھاؤ
جو ہڑوں میں موتیوں کی بھیر ہے
"خوابِ مہنتی" کی یہی تعبیر ہے
ہر طرف شربت کے نو آروں کا شور
تاچتے ہیں ہر طرف برنی کے مور
رُس گلے سر کوں پہ ہیں بکھرے ہوئے
جیسے تائے عرش پر نکھرے ہوئے
اے حسیں پر یو! انہیں چن چن کے کھاؤ
ان پر یہ نکلیں افسوس مت گراؤ
دیکھو یہ گاجر کے حلوسے کے محل
واہ ری بزمِ خدائے عز و جل
توڑ کر اک اینٹ چاکھو تو سہی
پیٹ میں اک اینٹ رکھو تو سہی
یہ نہیں پر بت یہ میں سوٹی کے کیک
کھاؤ ان کو کرسیوں کی لے کے ٹیک
یہ شکر کی ہے سڑک کھا جائیے
میٹھے کسکر تو میں جاں فرمائیے
آ رہے ہیں دہ جوشِ تر پے ہمار
لا رہے ہیں یہ مر پے بے شمار
پیر جنگل کے ثمر بردوش ہیں
مت ڈرو میدے کے یہ خرگوش ہیں
آم یہ لنگڑے ہیں پر لنگڑے نہیں
طوطوں سے پوچھو نہ گرائے یفتیں
توڑ لو پیڑوں سے یہ خوبانیاں
مت کرو بیکار آنا کانیاں
نخنے پنچھی سب تھامے ہیں غلام
چاہو تو ان کو بکار دے کے نام

اپنے اپنے اشیانے پھوڑ کے
لائیں گے جنت کے یہ پھل توڑ کے
سب کے سب پھل تم کو یہ کر دیگے پیش
مطلقاً ان کو نہیں کچھ منکر خویش
اپنی چونچوں سے کھلائیں گے تمہیں
رو رہی ہو تم ہنسائیں گے تمہیں
گر حسیں کو نہیں میٹھا پسند
میں ابھی حاضر کروں کچوالی چند

(۲)

یہ مجلس کے نان، یہ شامی کباب
ہو سکے تو کھائیے عالی جناب
شور یا ہدھد کا تھوڑا بھجے
کچھ چلاؤ ہی تناول کیجئے
کوفتے جگمگے کے یہ چکھئے ذرا
اک اٹھا کر منہ میں تو رکھئے ذرا
ہنس کے یہ گھونگٹ ذرا سرکائیے
"نہرا لفت" کی یہ پھلی کھائیے
یہ شتر مرغوں کے انڈے ہیں حضور
تاب میں رکھا ہے مرغِ کوہِ طور
ضد نہیں کیجئے اجی باز آئیے
مور کا تھوڑا متبخت کھائیے
نخنے چڑیوں کے سری پائے ہیں یہ
خوش ہو اسے جس نے بھی کھائے ہیں یہ
یہ دلِ بلبل کا ایرانی اچار
لے دہ پٹھارے جو کھائے ایک بار

یہ دُکھ کی پیاز یہ عربی سلاخ کھائے جو برسوں کے بعد اس کو یاد
جسم گرمی سے اگر گھبرائے ہیں ہم چمکتے مورچہ پل بھی لائے ہیں
وادی جنت سے کیوں بیزار ہو؟ خود کشتی کرنے پہ کیوں تیار ہو؟
بات کیا ہے دُلوں پہ تو بہت آؤ جوڑنا ہوں ہاتھ غصے میں نہ آؤ
احکام کیوں چمٹے ہوئے ہیں گال سے
پونچھ ڈالو ریشمی رومال سے

(۳)

عورتیں :-

جاؤ جاؤ کچھ نہیں کھائیں گے ہم فیصلہ یہ ہے کہ مرجائیں گے ہم
عورتیں سب سیدی راہوں پر چلیں نفع نیکی بن کے دُنیا میں چلیں
گھر سے باہر پیش جب کرتے تھے مرد گھر میں ہم بھرتے تھے آہیں سر درد
ہنس کے سہ لیں زحماتیں اولاد کی ہم نے دُنیا ئے حُسن آباد کی
کر دیا پورا ہر ایک حکیم حُسن اُس کا ہر سدا ہم لائے بجا

مکمل تھا شوہر محبازی ہیں خُدا اُن سے ہو سکتی نہیں عورت جُدا
ہم تھے سیدھے آگیا ہم کو یقین کھتی خبر کس کو حقیقت یہ نہیں
اُن کی اُلفت اپنی فطرت بن گئی گھر کی دوزخ اپنی جنت بن گئی
چونکہ کھتی شوہر پرستی فرض عین اُن سے پٹ پٹ کر ہمیں آتا تھا چین
اب تو ہر عورت فدا ئے مرد ہے اپنے اپنے مرد کی ہمدرد ہے
آج جب ہنگامِ محشر آگیا سامنے کچھ اور نقشہ چھا گیا
یک بیک دشمن ستارے ہو گئے مرد سب دوزخ کو پیارے ہو گئے
ہو گئے گمراہ بچاروں سے گناہ کر رہے ہیں آپ کیوں ہم کو تباہ؟
دل بھلا کیوں دیں گے بیگانوں کو ہم پیٹ دیں گے آج غلاموں کو ہم
ہم کو دیکھیں تو یہ ان کی یہ مجال نوح دیں گے ان کے لیے لیے بال
اپنا اپنا ہم کو گھر چاہیے کچھ نہیں بس ہم کو شوہر چاہیے
وہ ہیں بھوکے اور ہم جنت میں کھائیں وہ جُدا ہیں اور ہم خوشیاں منائیں
کچھ بھی ہو وہ ہیں شریکِ زندگی زندگی میں اُن سے ہے تابندگی
سچ تو یہ ہے وہ نہیں کرتے گناہ دوستوں نے کر دیا اُن کو تباہ

رشید احمد کے گھر دعوت اڑا کے
 مری کٹیایا میں وہ بیٹھی تھی ٹنگی
 نہ دو دن سے ملا تھا اس کو کھانا
 حبیب سا ایک مصرع گنگنا کے
 "وزیر آغا کی تازہ نظم سنو
 اب اس کے صبر کا پیمانہ چھلکا
 وہ غصے کی شکن مانتے پہ لائی
 ترے ساتھ آگئی پھوٹے مے بھاگ
 ارے چھوٹی سی تھی میں نظم آزاد
 ادب نے گردیا برباد تجھ کو
 زباں پر ذکر ملتو دن میں دس بار
 محاف اک بھی نہیں اور ذکر عصمت
 تبسم واجدہ کا کیا کروں گی؟
 مراد دل بھوک سے رنجور اگر ہے
 کلام میر بھی ہے جوش بھی ہے
 رہا میں گھر میں داخل مگر اسے
 کہا میں نے "ہو کیسی بلبلی چیں؟
 مگر یہ راز بندے نے نہ جانا
 کہا میں نے یہ اُس کے پاس آ کے
 ذرا کچھ شاعری کے پھول چمن لہ
 پڑا پیلا، گلابی رنگ ہلکا
 معاویہ بیٹے لگی وہ یوں دھانی
 وزیر آغا کی نظموں کو لگے آگ
 کیا پابست تر نے مجھ کو جلاؤ
 نہ اپنے ساتھ کرنا شاد تجھ کو
 کبھی لا کر نہ دی اک "کالی شلوار"
 بتا دے یہ کہاں کی ہے شرافت
 میں اُس سے پیٹ کیا اپنا بھروسہ گی؟
 مجھے کیا باجسہ مسرور اگر ہے
 نہیں ہے گھر میں اٹا ہوش بھی ہے؟

اگر قانون سے آیا غیظ مجھ سے کو
 ہوئی جب چائے کی بندی کو خواہش
 نہ مجھ ناشاد کی پروا کبھی کی
 کبھی آنسو نہ بندی کے سکھائے
 اگر تجھ کو نہ دیتا داد داتی
 کیا ہے جھنری نے تجھ کو برباد
 صلاح الدین اگر کٹیا میں آیا
 بہت سودا ادب کا سر میں ہوگا
 نہ گھریں اخترا لایاں آئے
 اُسے چاٹو گے چومو گے یہ ہے طے
 یہاں پر منتظر ایو بی جو آیا
 دکھانوں گی میں اس کو ایسے نشتر
 جو ناشد کی سنائی رنظم آزاد
 بڑی مشکل سے بیچیا تھا چٹٹ آیا
 مرے وہ اشتر کی احمد عباس
 سنایا فیض احمد فیض مجھ کو
 کہا "پڑھ لو ذرا حسان دانش
 جو کی آفسر شاد امرتسری کی
 بڑے صوفی تبسم بن کے آئے
 نہ آتی میرے گھر پر یہ تباہی
 جو آکر دے گیا بھوئی تجھے داد
 تو سمجھو میں نے واویلا مچایا
 وہ بولانا اگر ہے گھر میں ہوگا
 نہ اپنا وہ یہاں ایمان لائے
 مگر وہ جبر اسود تو نہیں ہے
 سمجھ لو میں نے ڈنڈوں سے ٹھیک کیا
 کہ ہنستا آئے گا جائے گارو کر
 ترے ساتھ اُس کو بھی کرو دنگی برباد
 وہ کیوں ایران جا کر لوٹ آیا؟
 وہ کر دے گا تر ابھی سنایا تاں

تو لیتے اُن کی شرافت لے کے باٹ بعد میں کرتے اُنہیں دوزخ الاٹ
 دی سزا اور کچھ نہ کی انکوائری یہ تو ہے سرماٹکل ادواہری
 سب فرشتوں کی غلط ہے دائری کچھ حقیقت اور زیادہ شاعری
 کیا وہ کرتے اُن پر جب آیا شباب کچھ چھنا لوں نے کیا اُن کو خراب
 بزم دنیا میں بھی یہ تھیں اُنکے ساتھ آگئے دوزخ میں ہی یہ اُنکے ہاتھ
 کھولتا ہے خون وہ آیا ہے طیش ہو رہے ہوں گے جہنم میں بھی عیش
 نعرہ برب ہاتھ میں ہیں جھنڈیا لے چلو جی ہیں جہاں وہ زندیاں
 دیکھتے ہی اُن کو اُٹھ جائیں گے مات زور سے دیں گے مکر یہ ایک لات
 کھٹ سے جب گھونسل پڑے گا تاک پر روکے گر جائیں گے فرشِ خاک پر
 جب پڑے گی پیٹھ پر لوہے کی سیخ اُن چھنا لوں کی نکل جائے گی چسیخ
 آج دوزخ میں وہ ہوگا قتل عام روئیں گے سب سانپ اور بچھو تمام
 لمبی لمبی لاکھیاں چل جائیں گی پوتیوں کو تانیاں یاد آئیں گی
 ساڑھیاں اور بلاؤں سب پھٹ جائیں گے چوٹیوں کے ساتھ سرکٹ جائیں گے
 کر کے اُن کی لمبی زلفیں تار تار ہم پہنائیں گے اُنہیں جونوں کے بار

لنگڑے اور کانے گدھے منگوائیں گے "دلسوں" کو اُن پر ہم بٹھلائیں گے
 اُن کو پھر پلوائیں گے تھوہر کا جوس ہر جگہ اُن کا نکالیں گے جلوس
 تمام لیں گے پھر گریبانوں سے ہم بیاہ دیں گے اُن کو شیطانوں کی ہم
 شوہروں کو آج واپس لائیں گے ہم کھلا کر اُن کو پھر خود کھائیں گے
 ہاں کھڑی ہو جاؤ اب تم صاف صاف کوٹھ کر دو اب جہنم کی طرف
 "زور سے بولو کہ شوہر زندہ یاداً
 "شوہروں کی بیویاں پائندہ یاداً"



حسین کالی گھٹا لہرائی جب بھی صحن گلشن پر
 تو اس عالم میں مے خانے کا مے خانہ پیا میں نے
 مگر سب سے بڑا یہ جرم میرا ہے میرے آقا
 غلط اک قافیہ دیواں میں اپنے لکھ دیا میں نے



شاعر خدا کے دربار میں

تیری دنیا میں سسے آج تک کیا کیا میں نے
 کوئی چھ سو ستاون مہ رُخوں کو دل دیا میں نے
 شبستانوں میں میرے رات بھر اکثر ہیں پریاں
 مدار روشن رکھا اپنے گناہوں کا دیا میں نے
 برہنہ لڑکیاں جب میرے آگے رقص کرتی تھیں
 انہی آنکھوں سے کوئی اُن کے جسموں کی ضیاء میں نے
 میرے گستاخ ہونٹوں پر بتوں کے نام لہتے تھے
 تیرا جب نام آیا اپنے ہونٹوں کو سیایا میں نے

میرا دوست

اِسْلاَم سے ہمارم دیرینہ شیطانُ الرَّجِیم
ہر ادا پر تیری عاشق ہے میرا ذوقِ سلیم
تُو نے بن مانگے ہی پوری کی میری ہر اک مراد
ہوں اگر انسان پہ احسان میں رکھوں گایاد
سب تیرے دشمن ہیں لیکن میں ثنا خواں ہوں تیرا
اے عظیم الشان افسانے میں عنوان ہوں تیرا
مرحبا صد مرچا اے شاطرِ اخلاک و ارض
حکم دے مجھ کو تو میں پورے کروں کچھ تیرے فرض
بزمِ عالم میں نہ قدرت دے سکی تجھ کو شکست
تُو نے ٹپٹ کر دیا ہے انتظامِ بود و ہست

دید بہ پھیلا ترا صحرا بہ صحرا ایم بہ ایم
نیکوؤں کو روند دیتے ہیں تیرے وحشی قدم
رحم آجاتا ہے تجھ پر کس قدر مصروف ہے
اِس پہ طرہ یہ کہ اُس دربار سے موقوف ہے
کچھ بھی ہو رہتی ہے ان آنکھوں کو تیری جستجو
آگے بل لیں، پرانے دوست ہیں ابیں اور تُو
کہہ کے میں اللہ اکبر جب بھی پڑھتا ہوں نماز
میرا کچھ نوٹس نہیں لیتا خدائے بے نیاز
سراٹھا لیتا ہوں اگتا کہ میں اُس دہلیز سے
خاکِ دل چپی "وہ" لے اک بندہ ناپتیر سے
جب بلاتا ہوں تجھے اک پل میں آجاتا ہے تُو
راستہ سیدھا ہو یا الٹا بتا جاتا ہے تُو
"وہ" ہے کتنی دور اور تُو کس قدر نزدیک ہے
"وہ" ہے اوروں کے لئے میرے لئے تو ٹھیک ہے

میرے مُرشد کب تک تیرے لئے آہیں بھروں؟

تو نظر آئے تو ہاتھوں پر تیرے بیعت کروں،

حشر کے دن جانِ جاں دھوکا نہ دے جانا مجھے

بزمِ دوزخ میں بھی اپنے ساتھ لے جانا مجھے

تو ہمیں مانے گا میری تو حرام اللہ ہر ہے

تو مصیبت ہے اذیت ہے بلا ہے قر ہے

بھاگ جا میں تیرے دھوکے میں نہ ہرگز آؤں گا،

میں نہیں آؤں کہ تیرے جال میں پھنس جاؤں گا



مثنوی قمر البیان

شاعر اور یاد غار

وزیرِ آغا سنو میری کہانی اگرچہ یہ مسلم کی ہے زبانی
کہانی درد سے بھر پور ہے یہ کہ تصویرِ دلِ بچہ ہے یہ
دمِ آغاز "دو نعرے اور اک داف" دمِ انجام "دونالے اور اک آہ"
جو تارِ دل پر رکھ دی ہیں نے مفراب تو مکر آؤ گے سر ہو ہو کے بنیاب
بہادور گئے یکایک اشک اتنے فلک کی آنکھ کے تارے ہیں خلیج
مرا کوئی نہیں ہر روز تم سا میں ڈھونڈوں گا کہاں مساز تم سا
ابھی سے بڑے بڑے یا نہ اتنا رو ہو جاؤ گے بیمار

ہوئے جاتے ہو تم کیوں پانی پانی ذرا رو کو یہ اشکوں کی روانی
 ذرا کچھ دور ہٹ جاؤ مرے یار قلم کی اب چپ لٹا ہوں میں تلوار
 بنام شاہد "نازک مرزا جاں"
 بطیب خاطر ظالم "سما جاں"

آغاز داستان

یہ کوئی چھ برس پہلے کی سی بات نہ تھی جب فکر کوئی مجھ کو دن رات
 میں بے فکری سے دن بھر گھومتا تھا پیسے بن ہر قسم پر بھروسہ تھا
 مری دنیا میں آئی اک حسینہ پھنسی جیسے انگوٹھی میں نگینہ
 ریاض خلد کی ہنستی کلی تھی بڑے ناز و نعم میں وہ پتی تھی
 بہاروں کی جیسے مسکان تھی وہ بلا تھی اتر تھی، طلوت ان تھی وہ
 مرے چہرے پر اس کو رحم آیا نظر ملتے ہی اُس نے دل ملایا
 جو میں نے مسکرا کر اُس کو دیکھا تو جھٹک کر کی سو اُس نے پھول بھینکا
 نگاہیں پڑ گئیں وہ میرے پیچھے وہ تھیں بے چین اوپر اور میں نیچے
 ادائیں اُس نے دکھلائیں جو ہنس کر مرادل رہ گیا زلفوں میں پھنس کر
 چھڑی آغز انداز الفت کی کہانی
 مگر فی الحال اشاروں کی زبانی

اداس کے بعد

قدم اب عشق نے آگے بڑھائے جو آداں دل میں تھے ہوٹوں پر گئے
 ملاقاتیں ہوئیں دو چار چھپ کر محبت کے ہوئے اقرار چھپ کر
 وہ بولی ہر مصیبت میں سہوں گی خوشی سے تیری گنگیا میں رہوں گی
 میں لعنت بھیج دوں گی اپنے گھر پر چلی آؤں گی میں سب سے کم زیور
 یہ سن کر میں نے کی جب کچھ پس و پیش وہ بولی سمت کروں کر کم و بیش
 بہت کچھ نقد بھی لاؤں گی پیار سے مری لاکھوں امیدوں کے بدلے
 محبت کا خزانہ ہوں چسرا لو مجھے فوراً اب اس گھر سے بھگالو
 بہت سے آہے ہیں گھر میں پیغام نہ ہو جائے جوانی میری نیلام
 نہ تڑپاؤ مجھے جلداد بن کر
 کہیں اب لے چلو فریاد بن کر

میرا انقوا

ٹی ندیا پہ مجھ کو دوسرے دن لگی کہتے "کہ ہوں گی اب نہ تجھ بن"
 کہا میں نے "ارے میں تو ہوں شاعر" وہ بولی "یعنی دل لیتے ہیں ماہر؟"
 "مگر" کہہ کر جو میں نے سر جھکایا مری سمت اس نے ہاتھ اپنا بڑھایا

کلائی تھام کر بولی "چھڑا تھ" ارے دست نہ لینا ہے مرا ہاتھ
 پکڑ کر مجھ کو لے آئی مرے گھر پسینہ آگیا میری جبیں پر
 لگی کہنے "مے کس ناز نہیں سے؟" پسینہ پونچھے اپنی جبیں سے
 ندی پر سے تجھے بہت سی اڑا لائی تجھے میں تیرے ہی گھر میں بھگا لائی
 مرا گھر کیا تھا؟ اک چھوٹی سی کٹیا
 یہیں ڈوبی مری قسمت کی کٹیا

طوفان بہ "حبیب" اندر

حبیب توں قزع گھر آگئی تھی یہ بدلی سب جہاں پر چھا گئی تھی
 ملائی جب وہ آنکھیں ہو کے دم موش محبت کھول دیتی ہنس کے آغوش
 میں سُن کر اُس کے پائل کی چھا چھم بہا دیتا خوشی میں دل کا ہر عنص
 جب اُس کی چوڑیاں ٹکرا کے بختیں ہزاروں دلتیں سی دل میں سمجھتیں
 سرودِ سرمدی تھی اُس کی آواز کہ جیسے رنج ہے ہوں سینکڑوں ساز
 مرا سرگم تھی وہ سنگیت تھی وہ غزل تھی وہ سراپا گیت تھی وہ
 جب اُس کے دیکھتا ہندی رچے پاؤں میں کہتا "ایں پہ گرنے کے لئے آؤں؟"
 وہ جب اُن سرمدی آنکھوں سے نکلتی جنوں بن کر محبت سے چمکتی

لیے شانوں پر زلفوں کی گھٹائیں لگا کر خطِ پیر قتی دائیں بائیں
 وہ رعبِ حسن اس بندے پر چھانا کہ بندہ دُور ہٹ کر ہسم جانا
 مگر اک روز جرات سے لیا کام محبت سے لیا اس شوخ کا نام
 کہا پھر میں نے اُس سے تمام کرات "ادھر دیکھ! آج ہے کتنی حسین رات
 حیا کے پھینک دے رنگین پردے مجھے ہر قسم سے آزاد کر دے
 میں کیسے اتنے ارمانوں کو روکوں؟ میں کیونکر آئے طوفانوں کو روکوں؟
 بڑھی وہ میری جانب ہو کے دم موش ریاضِ خلد خنی شاعر کی آغوش
 مجھے دے دی نویدِ وصل اُس نے پلا ڈالی "شرابِ وصل" اس نے

وہ دُلمن سی بنی ہر رات میری

عجب ہر رات تھی ہیہات میری

عہدِ بہیمان

غم و اکلام سب سوئے ہوئے تھے نہ جانتے ہم کہاں کھوئے ہوئے تھے
 مبرا اک پل بھی وہ مجھ سے نہ ہوتی خوشی سے رات بھر ظالم نہ ہوتی
 گئے میں ڈال بانوں کا حسیں ہار جگا دیتی مجھے شب میں کئی بار
 نگاہوں سے وہ کرتی یہ اشارے نہ سوؤں گی نہ سونے وہ نگاہ سے

مجھے وہ وہ ادائیں وہ دکھاتی خوشی میں کشتی دل ڈوب جاتی
 کھلا کر آرتے دونوں کا وہ گلزار یہ کہتی "اُمّے" پسلو میں دلدار
 "اگر فردوس بردہ سے تین اسف" ہمیں است وہیں است وہیں است
 کبھی شاعر جبراً مجھ سے نہ ہونا نہ اپنی عساشقی کی لاج کھونا
 ترے بن ایک پل جیسا ہے دشوار جہاں فانی، نہیں فانی مرا پیار
 کسی دن کھو دیا گریں نے تجھ کو سمجھ لے موت آجائے گی تجھ کو
 میں ترے ساتھ فلتے بھی کر دوں گی

ترے آنکوش میں تہنس کہ مروں گی

ہر روز روز عید

نہ تھی کچھ کمرہ کو مال و زر کی حقیقت سے محبت بے خبر تھی
 بچے نہ یوں مرے ہم نے اڑائے وقا کے گیت ہم نے گنگنائے
 نہ کھائے تھے کبھی ہم نے جو کھانے کھلائے پیٹ بھر بھر کر خدا نے
 بھڑی مرغی پہ چلتی دن میں دوبار تھی دسترخوان پر کھانوں کی بھربار
 مرے گھر دودھ کی مہر تھیں جاری پھلوں کے ٹوکے تھے بھاری بھاری
 میں میں سیبوں کا پتیا دن میں دس بار مٹھائی کے لگے رہتے تھے انبار

عجب دن تھے عجب تھیں پیاری تھیں زباں پر ہر گھڑی لاکھوں کی باتیں
 کہا جب دل نے جھٹ ٹکیٹیں مگالیں ہزاروں ہم نے فلمیں دیکھ ڈالیں
 مدد ہم ٹیکسیوں میں گھومتے تھے وہیں اک دوسرے کو چومتے تھے
 گئے کپڑے پرانے سل گئے سوٹ گئی چپل پرانی - آگے یوٹ

ہوئے معلوم سینٹ اور عطر کے بھاؤ
 سنی جتنی بھی قیمت جھٹ کہا: لاؤ

میں اویں

ملازم پانچ رکھے میں نے ہشیار سلام اُن سے کرتا دن میں چھ بار
 ملاقاتی جو میرے گھر پہ آتے وہ اکثر منہ کی کھا کر لوٹ جاتے
 مرے در پر کھڑا رہتا تھا جو "گارڈ" وہ کہتا اُن سے لاؤ وزٹنگ کارڈ
 بغیر اس کے نہیں ہوتی ملاقات یہ سب سرکار نے دی ہیں ہدایات
 نہ ہوتا موڈ میں اُس وقت اگر میں تو کہہ دیتا کہ "صاحب گھر نہیں ہیں"
 بہت کم اب ملا کرتا میں گھر میں کہ ہوتا "والس رائے کے ڈنر" میں
 میں اکثر چار کو اب نور کتا جی بس کیجے کو "او نمور" کہتا
 گئی سب خاکساری، آگئی میں "کہ یوں لائے کے سگریٹ پھونکتا میں"

محلے کے امیروں سے اجھتا انہیں اُلو کے پھٹے میں سمجھتا

مرے گھر سب ادیب اجارہ سے تھے

مرے سے رات دن پی کھلے تھے

آسمان کی حرام زدگی

نہ بھایا آسمان کو گھر کا یہ رنگ بیکایک آپڑی اس رنگ میں بھنگ

وہ زیور ہی تھے، کتنے روز چلتے دیا بھجنے لگا یہ جلتے جلتے

غریبی نے جو دی اس گھر پہ دستک نسا فی دی دلوں کی ہم کو دھک دھک

بیکایک چونک اٹھے گھر لگے ہم ارے اب کیا کریں، چپکرا گئے ہم

مجھے محسوس اب ہونے لگا یوں کہ سب بیکار تھی میری اکڑ فوں

جب اُسے گھر میں فلتے مسکرا کر ہوئی وہ غرق مسکرا نکھیں جھکا کر

دیا عاشق کا پھر بھی ساتھ اُس نے نہ جھٹکا عاشقی کا ہاتھ اُس نے

بیکایک ہو گئے سب طور بے طور عجب تھا زندگی کا یہ نیا دور

وہ روکھی روٹیاں اب کھا رہی تھی چنے اب بھاڑ سے بھنوار ہی تھی

وہ سنتو پھا نکمتی، گٹیاں چباتی مجھے نکمتی، جباتی، مسکراتی

وہ کہتی پھر گلے میں ڈال کر ہاتھ "بہت ہی خوش ہوں میں، ہر ترے ساتھ"

۲۰۸ میں کہتا "واہ! کیا لڑکی ملی ہے کئی جنت کی دوزخ میں کھلی ہے"

رہے نام اللہ کا!

کٹا لے لے کے قرضہ کچھ زمانہ چلا کچھ روز بول نہی اسب و دانہ

کہاں تک قرض ہم لے لے کے جیتے سسکے اب لگے دل زندگی کے

نہ شاعر کو کسی درس سے ملا کام ہر اک درس سے وہ لوٹا ہو کے ناکام

بجیں گھر ٹپاں، بچے زیور بچے سوٹ کبھی گروی پڑی سارھی کبھی بوٹ

پڑا سامان کچھ گروی، بکا کچھ نہ اللہ کے سوا گھر میں رہا کچھ

یہ بھی جاتا راتفاق سان کے نام ہوئی جاتی ہے عزت میری نیلام

خدا را کچھ مدد بندے کی کیجے

نہیں تو دور و پے ہی پہنچ دیجے

قرض خواہوں سے تنگ

کیا اب قرض خواہوں نے مجھے تنگ بہت روکا انہیں پر ہو گئی جنگ

مگر تھا حوصلے والا بڑا امیں مجاہد کی طرح اُن سے لڑا میں

کسی کو اپنے گھولنوں سے بچھاڑا کوئی ترچھا گرا اور کوئی اڑا

کسی کٹھنڑے کو دے کے بھیجا گالی کسی کی جیب سے نقدی اڑا لی

جو گھر میں روز دے جاتا تھا اندے گیا وہ تڑکے تڑکے کھا کے دھڑ سے

کسی خم ٹھونک کر آئے جو آگے
دوٹی دے کے بھنگی کو رلایا
معاف عزت چپ کر اپنی بھاگے
اکٹی دے کے ہر نوکر بھگایا
بہت ظلم اس "عفی عنہ" نے ڈھائے
خدا اس کو جہنم سے بچائے
کہو اے پڑھنے والو مل کے آئیں
کہو شان کریم کی نہ تو ہیں

حسیلہ سے میری پہلی مکاری

یونہی گزرے کئی دن اور راتیں
تھا اپنے شہر کا شاعر بڑا ہیں
کبھی اکھنت، کبھی فاقوں کی باتیں
بہت سی اس پر نظمیں لکھ گیا میں
نہ تھا کچھ اُس پر مرنے کے سوا کام
میں اس کو گیت مکھ لکھ کر سناتا
عجب سوچھی مجھے اک روز تدبیر
یہ سوچا شاعری اس کو سکھا دیں
بنادوں اس کو بھی خاقون کا عادی
کوں لے تو بھی اب درد کے دن کلٹ

پچھتے ایسی کہ پھر جانے نہ پائے
یہیں پر بیٹھ کر گرہیں لگائے

پہلا سبق

دیا پہلا سبق اُس نہ لفت کو
بتایا کیا ہے "سکتہ" کیا ہے "ابہام"
مسلماں کر لیا کافر ادا کو
یہ "غوبی" آجکل کیوں ہو گئی عام
ہے کوٹھہ یار کا کب اور گلی کیا
ہے "ایٹلے جلی" کیا اور "صحنی" کیا
میں کہتا "جا ہلاتن جیسا ہلاتن"
پکارو "فاعلاتن فاعلاتن"
جب اُس کا دیکھتا میں پھول سا مٹنہ
وہ کہتی "فاعلاتن فاعلاتن او ہنبا"
بہت ہی اس کو حبیب بھریں سکھالیں
"کلام تمیر" کی غزل لیں رٹالیں
قصیدے ذوق کے اُس کو "پلائے"
اسے غالب کے سہرے بھی لنگھائے

دیے پھر شاعری پر ایسے لکچر
سُنے جو اس پر یسیر کرے منہس کر

شاعر اصلی کی تعریف

کہا میں نے کہ جو شاعر ہے اچھا
نہ ہرگز زندگی میں کچھ کرے کام
صردری ہے کہ ہو اُلو کا پھٹا
ہر اک در سے وہ ہر کے نوٹے ناکام
جو ممکن ہو خستہ شاد رکھے
سدا وہ زندگی برباد رکھے

پڑھائی اُس نے پھوڑی ہو آدھوری
 نہیں تسلیم اُس کو کچھ نہ فری
 ہے اور ج شاعری فاقول سو مرنا
 فلک پر روکے ہر الزام دھونا
 بڑے معشوق کی صفیتیں کرے وہ
 وہ کیسا بھی ہو بس اُس پر مرے وہ
 اگر ہو بد چلن بھی اُس کا معشوق
 نہ ملے اس کو لاٹھی اور نہ بسندوق
 خوشی سے یہ کہے تو بے دغا ہے
 مگر پھر بھی مرا یہ دل ترا ہے
 بھرے سرواں میں دل کو تمام کر دہ
 بنا دو مال روئے رات بھر وہ
 کوئی تیر نظر دل میں لگا ہو
 "نغم درو جگر" ہیں مہبت کا ہو
 مکھے غزلیں کرے پیدا وہ بچے
 جو ممکن ہو تو دو دو ہوں اکٹھے
 سدا بھوکے اٹھیں بھوکے وہ سوئیں
 اگر روئیں تو سب وہ مل کے روئیں
 حمیں بیوی کے کپڑے مل گئے ہوں
 اور اس کے منہ پہ پونے چھینچے ہوں
 رکھے پتلون گروی اور پئے مے
 بالآخر بیچ ڈالے اپنی ہر شے
 کھلے رکھے وہ شب کو اپنے دیدے
 گئے تارے، مکھے سہرے قصبے
 پھر اپنے پر چھری اس طرح چلوائے
 کلام اپنا کہیں بھی مفت چھپوائے
 غزل اپنی ترنم سے سنائے
 کلام اُس کا اگر کرنے لگے یور
 اگر ممکن ہو تائیں بھی لگائے
 اگر محفل میں برپا ہو کبھی شور

نہ جی ہارے وہ پڑھتا ہی چلا جائے
 رہ ہمت میں پڑھتا ہی چلا جائے
 یہ سب سن کر لگی کس نے مری جاں
 "اور اس کا نام ہو مہادی علی خاں"

شاعری پر ایک لکچر

کہانی اصل شاعر کی شنا کر
 دیا اک شاعری پر اس کو لکچر
 نظر آئے نہ جو شے وہ کمرے
 نظر آجائے جو تیر نظر ہے
 لب معشوق ملتے ہیں میں میں
 کہیں ملتے نہیں اپنے وطن میں
 نہ ہو معشوق کے گاہوں پہ گر تل
 کسی کا اس پہ آسکتا نہیں دل
 نہ ہوں گر تل تو بنیے سے منگالو
 اٹھا کر ایک دو خود ہی لگالو
 بچے کا تل کے جلوں سی کوئی کب
 فنا ہو جائیں گے اہل نظر سب
 جو دیکھے گا وہ ہو جائے گا برباد
 کوئی مجنوں بنے گا، کوئی فراد

معشوق کی چال

کسی معشوق کی اپنی نہیں چال
 وہ اوروں کی ہے منت کش ہر حال
 کسی کو مورنی چلنا سکھائے
 کسی کو "فنی" یہ بی ہر فی بتائے

کسی کی چال میں مستی اگر ہے تو سمجھو اس پر ہستی کی نظر ہے
 نہ آئے تم کو گر چلنا ادا سے تو جہاں کر سیکھ لو یاد صبا سے
 یہ بونے چھٹے چلتی ہے پیاری
 گلستاں درگستاں کیاری کیا ہی

معشوق کی زلفیں

اگر تم کو کوئی ناگن نظر آئے تو یہ سمجھو کسی کی زلف لہرائے
 مگر اس زلف سے خود کو بچاتا تھا راہ تھو اس کو مت لگانا
 یہ چلتی پھرتی چٹیا کا سہی گئی تمہاری زندگی سب چاٹے گی
 کوئی زلفوں کو لمبی شب بنائے جو اندھوں کو نظروں میں بھی آئے
 ہر اک مجرم نے جو پہنی ہے زنجیر
 وہ داروغے کی ہے زلف گرہ گیر

قد محبوب

قد محبوب کتنا ہو بناؤں چلو اک سرو میں تم کو دکھاؤں
 نہیں یہ بھٹ چھڑایا بڑا ہو ضروری ہے کہ گلشن میں کھڑا ہو
 قیامت سے بھی ہے تشبیہ اس کی اگرچہ کچھ نہیں تو جیہ اس کی

اچھی آنکھیں

جو اچھی آنکھ کی چپان چاہو کہیں سے پھول نرگس کا مٹکا لو
 نہ آنکھیں ہوں اگر ہمارا آنکھیں سمجھ لینا یہ میں بے کار آنکھیں
 مگر یہ شرط بھی ہے ہوں گل لابی بڑی جتنی کہ ساسر اور رکابی
 بہت سے لوگ انہیں کہتے ہیں بادم
 شرابی لوگ کہتے ہیں انہیں جام

منتفرقات

اگر تم ڈوبتا جا ہو مری جاں تو ہے اس کے لیے چاہ زخماں
 کسی کے ہاتھ میں دیکھو جو تلوایے پھرتا ہے سمجھو ابرو سے یار
 کہیں بجلی جو گرتی ہے فلک سے تو دل سینے میں رہ جاتے ہیں صا
 اگر بجلی گرا دے منس کے معشوق نہ آئے گی صدائے توپ و ہندوق
 شرک پر گر نہ مٹی ہو نہ ہو دھول وہاں بکھرے ہوئے ہوں جا بجا پھول
 سمجھ لینا حیں کوئی ہنسنا ہے

"ابھی اس راہ سے منس کر گیا ہے"

عشق کا موسم

یونہی گزرے کئی راتیں کئی دن
وہ بولی ایک دن دل میں اٹھی بگڑ
کھامیں نے کہ "لا دوں گا میں کھانا"
ادھر آؤ سکھانا بعد میں بال
تہارا امتحان میں آج لوں گا
وہ بولی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر
جنوں اٹھتا ہے جب آئیں ہمارے
نہیں جلیں، یہ مرنے کا ہے موسم
اسی موسم میں کھو جاتے ہیں شاعر
ترپتے ہیں بچتے ہیں وہ ہر سال
مگر رہتی ہے وہ منہموم و خاموش
قتلاروں میں رکھے رہتے ہیں گلے
کراہتی ہیں کلیاں عشقی بالجمید
چمن میں آستیاں ہوتے ہیں اکثر
عجب تھی زندگی خوراک کے بن
میں بولا "کیوں، وہ جھٹ بولی" مگی بھوکنا
مگر پہلے "سبت" پچھلا سنانا
سناؤ "عشق کے موسم کا کچھ حال
ہو نہیں گری پاس کھانا لاسے دوں گا
مجھے پچھلا "سبت" سارا ہے ازیر
چمن میں گل گریباں اپنا چاروں
کسی سے عشق کرنے کا ہے موسم
قفص میں بند ہو جاتے ہیں شاعر
صبا سے پوچھتے ہیں یاغ کا حال
یہ سر کر کے ہو جاتے ہیں بے ہوش
کہ بھنورے کر سکیں کلیوں پہ جلے
وہ ہر سختی کو سہہ دیتی ہیں بالقبیر
کہ جلی گری کے آ کے اُن پر

کبھی گرتی نہیں ہے یہ زمیں پر
یہیں پران کے گاتی ہے قمری
پہیا بھی یہیں اندوہ گیس ہے
یہیں پر بیوہ کو تل غم سے کسلانی
صبا کا پوسٹ بین آتا یہیں ہے
اسی موسم میں دل دے کر گلوں کو
وہ ہو جاتی ہے اس موسم میں بہار
بس اب میں تھک گئی ہوں لاؤ کھانا
خدا کے واسطے جلدی مہنگا

ایک ادیب کی

بریا جان تم سے سو گئی تھی
وہ میری عقل پر رو دھو گئی تھی
بصد منت اسے میں نے جگایا
خدا کھا کر کچھ آیا اس کو جب ہوش
محبت سے بھٹا کر سا تھا اپنے
کیس ایران جا کر کھو گئی تھی
بہت ہی بور شاید ہو گئی تھی
"پلاؤ" اس کو تھوڑا سا کھلایا
تو کھولی اُن تھکی آنکھوں نے غوش
پہرا کر اس پہ وہ دن باتھ اپنے

اُسے اہلِ تسلیم کے دکھ بتائے جنہیں سن کر گلیجہ مُنہ کو آئے
 گئے اُن ناشوروں کے رات بھر نام ادیبوں کے جو اکثر کھسکے دام
 بنیں گے جو کبھی دوزخ کا اندھن خرابلیس کے دانتوں کا منجن
 ادیبوں کی اسے "لسٹ" اک گھواٹی زبانی یاد جو سب اس سے کرواٹی
 مرا گھر مرکزِ علم و ادب تھا کہ "دنیا سے کتب" کا میں قلمب تھا
 بہت ساری کتابیں اس کو لاویں ہزاروں علم کی شمعیں جلا دیں
 تخلص اس کا رکھا میں نے جنت
 مٹی پہلی نظم اس کی "باغِ اُلفت"

حسینہ اور نوہینہ

اسی عالم میں گزرے نوہینہ کھلایا اک نیا گل زندگی نے
 یہ اُلفت کی کہانی رنگ لائی مرے ماحول سے وہ تنگ آئی
 میں جب کہتا کہ "تو کتنی حسین ہے" وہ کہتی "گھر میں اک پیسہ نہیں ہے"
 میں اک دن باغ سے اک پھول لایا نہ اس نے اس کو باؤں میں سجایا
 لگی کہنے "اجی اس کو ہٹاؤ" کہیں گو بھی کا بھی اک پھول لاؤ
 چمن کے پھول کب تک لاؤ گے تم مجھے کب تک چنے چواؤ گے تم
 بس اب اس شاعری سے باز آؤ کسی دن پیٹ بھر کھانا کھلاؤ

فراموش گردند عشق

گئی کھلا وہ صورت بھولی بھالی "لگی ہے بھوک" وہ اک روز بولی
 کہا "میں نے کہاں سے لاؤں پیسے" کہا اس نے کہ "تم عاشق ہو کیسے؟"
 "یہ بہتر ہے کہ اب کوئی دھنڈا" کہا میں نے "ہٹو، شاعر ہے بندہ"
 کہا اس نے "نہ گرہ کچھ کھاؤں گی میں کسی دن دیکھنا مر جاؤں گی میں
 بتاؤ پھر کرو گے پیار کس سے؟ یہ دوا نکھیں کرو گے چار کس سے؟
 بہت دن تک رہی چلتی یہ ٹکراؤ لڑے آپس میں دونوں بھوکا اور پیاسا
 سراوہ شوخ ہاری میں نہ ہارا "ادب" تھا زندگی سے مجھ کو پیارا

وہ دشمن ہو چکی تھی اب ادب کی

ادب کے نام تک سے جاں بلب تھی

شمع حرمیں

وہ اک دن گھر میں آہیں بھر رہی تھی کہ مستقبل سے شاید ڈر رہی تھی
 ہوا جب ہنس کے میں کٹیا میں داخل تو اس کو دیکھ کر صدمے سے گھائل
 کہا "یہ کس کا ماتم کر رہی ہو؟" یہ ٹھنڈی آہیں کیوں تم بھر رہی ہو؟
 وہ بولی "اپنا ماتم کر رہی ہوں میں دل کو خوگر غنیمت کر رہی ہوں

نہ جانے کس جہاں میں کھو گئی میں سہاگن ہو کے بیوہ ہو گئی میں
نہ ہے کچھ کھانے پینے کی ضرورت
نہ ہے کچھ روتے جلنے کی ضرورت

مخدوش حالات

جو دیکھے میں نے یہ مخدوش حالات دیا اس کو دلاسا مقام کر بات
کہا اس سے کہ یوں گھبرانہ پیاری نہ دل پر ڈال غم کا بوجھ بھاری
ہیں تھوڑے سے ابھی تکلیف کے دل یہ دولت رہ نہیں سکتی مرے رہ
یہ چیخیں مارتی آئے گی پیاری یہ آ کر ختم لے گی تیری ساری
نگی ہے آج اگر افلاس کی چوٹ توکل تو ہی گنے کی رات دن نوٹ
بہی بیہمی ہے کیوں غصے سر بند تو میں بھر دوں گا ترے نوٹوں سے صندوق
لگانے کو ہوں میں دولت کے انبا تجھے پہناؤں گا نولاکھ کا حصار
رسالوں میں بہت میں آ رہا ہوں بہت مشہور ہوتا جا رہا ہوں
جو نہی پچھلی ذرا بھی میری شہرت تو جھٹ آ جائیگی اس گھر میں دولت

ابھی تو "کورٹ شپ" کا ہے زمانہ

نہیں ہے دور "خواب اپنا" سہانا

پڑوسن کی تباہ کاری

مری کٹیپا سے تھوڑے فاصلے پر مرے اک دوست شاعر کا بھی تھا گھر
بہ حال زار ہی رہتا تھا وہ بھی ستم افلاس کے سہتا تھا وہ بھی
تھا اس کا نام عطاء اللہ سجاد تھا عرف اس کا نقاء اللہ برباد
مرے گھر آئی اک دن اس کی بیگم بتایا میری "اُس" کو اپنا ہر غم
ادبوں کے جو اس نے ذکر چھڑے مرے بچے بھی ظالم نے آدھڑے
کہا اُس سے بہن اب صبر کرنا یہی بہتر ہے دل پر جب کرنا
الہی توبہ! شاعر اور پیسہ؟ ہوا سے کیا کبھی دُنیا میں ایسا
یہ "جیپا رے" سدا بھوکے مر گئے گھروں میں اُن کے ہم آہیں بھر گئے
کہیں جو بھی اُسے سمجھو "غسل" کہ جھوٹی ہے ہر اک اُن کی تسلی
بہت ہوتی رہی آپس میں باتیں یونہی گزرے کسی دن اور راتیں

میں ان باتوں سے بالکل بے خبر تھا

ہوا اک دن وہی کچھ اجس کا ڈر تھا

حسین شاہ اور ادیب

حسین موسم تھا اور رست مٹی کلائی ہوائیں مست تھیں جیسے شرابی

کبھی ہوتا ہے یہ محسوس مجھ کو بگگائے جانے گا وہ روس تجھ کو
 کسی "روس" سے ہائے میرا اللہ نہ بنا ہوا دے کہیں وہ تیرا پتہ
 "ندیم قاسمی" سو بار آیا کبھی اس نے بس مجھ کو بسایا؟
 میں ہو جاتی تھی شہر کے گلابی وہ کیوں اسخر مجھے کہتا تھا بھابی؟
 تم آخر کس نشے میں ہو گئے غین سدا ذکر کتاب "قصرۃ العین"
 دسے میں "آگ" کے دریا میں چپکوں "سچی" ہوتے ہوئے میں اس کو دیکھوں
 نہ یاں آئے کھنیا لال "مردہ" "پیر آباد" کا مشہور گروہ
 جو ہنس ہنس پکڑیاں سب کی اچھلے ذرا اب اپنی ٹوپی بھی سنبھالے
 نہ سمجھو شاذ کو میں چھوڑ دوں گی میں اس کی ملکیت بھی توڑ دوں گی
 مجھے اس تو نسوی کی فکر بھی ہے ببول پر تیرے اس کا ذکر بھی ہے
 عدم "ملک عدم" جاتا نہیں کیوں یہ اب جینے سے باز آتا نہیں کیوں؟
 میں تنگ آئی تری بد عہدیوں کو یہ آئے دن کی "باقر عہدیوں" سے
 ادب نے گر مجھے نی بی کرائی کرے گا کیا قاتل احمد شفاقی؟
 کنویں میں کرشن چندر کو میں چپکوں ہے ڈوبایا نہیں اُپر سے دیکھوں
 زباں سے لفظ بی بی گر نکالا بجا دوں گی میں فوراً تیرے بارہ

بتا مجھ کو ترساح کس کہاں ہے کہاں وہ دشمن شاہ جہاں ہے؟
 مبادے پھاڑ دے دیراں فانی "مال سوز غم ہائے نہانی"
 تنہا رہا ملے اب تک ہر ہی تلور میں ڈالوں بھارت میں اس کا "نیا دور"
 یہاں نقش اور نقش "آنے نہ پائیں" طفیل اور شاید احمد بھی نہ آئیں
 نہیں یہ شاہد احمد مجھ کو بھساتا جو "سید" ہو کے ٹھہری بھی ہے کھاتا
 جو ہوتی کچھ شرافت اس میں باقی رسالے کا نہ رکھتا نام "ساقی"

اوہرا آتجہ کو سیدھی رہ پہ ڈالوں
 "خلیل الاعظمی تیسری کالوں"

بینٹ گراموفون

بہت سے اور بھی لبتی گئی نام دیے سو سو ہر ایک شاعر کو دشنام
 ادیبوں کی بہت کی اس نے توہین پکڑ کر سر میں بھیجا ہو کے غم گین
 بہت چچ چچ کے بعد آگیا میں جب اس بکواس سے تنگ آگیا میں
 یہ پھینکا میں نے فقرہ اس پر کس کر "گراموفون کی اولاد بس کر"
 چمک کر بول اٹھی وہ ماہ سپارہ "کہا کیا ہے؟ ذرا کہنا دوبارہ"
 میں بولا بہت برقی و باد ہے تو گراموفون کی اولاد ہے تو
 بجی ہے گر تو بجتی ہی رہے گی؟ جو گر جی ہے گر بتی ہی رہے گی؟

راجہ مہدی علی خاں کی شاعری

جو دیکھا میرا اندازِ زبان اور
زبان میرے لیے بھی اُس نے کھولی
”تو شاعر ہے یا اب تو بھی ہے شاعر
تری نظیں ہیں کیا کچرے کا ہیں ڈبیر
”ان ہیں کچھ“ اُلٹ ہے اور نہ کچھ پھیر
”ان ہیں“ سرگانی“ اور نہ ”ابہام“
”غریبی“ ہے نہ ہے ”مزدور“ ان ہیں
کبھی لکھا کسی نے تجھ پر سنسوں
بہت سوں کو بنایا اُس نے اُو
جو ملک ہو تو اُس میں ڈوب مرنا
مگر یہ شاعری مڑ کر نہ کرنا

دیارِ شعر کے ادنیٰ اسے نہ ہوا

وزیرِ آغا تجھ کو دے گا برباد

کچھ وزیرِ آغا کے ہائے ہیں

میں اب تک اُس کے سب باتیں تھا خاموش جو ”ذکرِ یار“ آیا آگے جوش

کہا میں نے یہ جبر کر آہ ٹھنڈی
وہ دنیا کے شرانت کا خدا ہے
وہ چاہے تو تجھے کر دے ابھی ٹھیک
اُسے مت فیض احمد فیض سمجھو
اُسے چودہ حواسوں پر ہے قابو
وہ بیٹھا ہے وہاں خاموش چپ چاپ
جگہ سے اپنی وہ ہلتا نہیں ہے
برس میں اک دھند وہ بولتا ہے
کہوں کیا ہیں ”جلالی“ پیر ہے وہ
بر شیر اُس کی جب تکتے ہیں مہیت
نہ شیطاں ڈر کے اس کے پاس جاٹے
بہ ظاہر ہے وہ بھیں اور بے جاں
سمندر دیکھ کر اس کو سمٹ جاٹیں
کبھی چنچے تو سو طوفان آ جاٹیں
جھکی آنکھوں کو اشکوں میں جھگو کر

وزیرِ آغا کی مت کر بات رنڈی
سمجھ مت یہ کہ وہ مجھ سے جدا ہے
اسکے جوں تری شہ رگ کے نزدیک
غضب سمجھو اُسے یا غیظ سمجھو
ہے سرگودھے کے جنگل میں وہ سادھو
اُسے ”ڈرٹرب“ کرنا ہے ہما پاپ
کسی ذی روح سے ملتا نہیں ہے
بڑی مشکل سے دہ لب کھولتا ہے
تیرے تیرے، شیرے، شیرے وہ
تو کر جاتے ہیں جھٹ ہاتھوں پہنیت
اگر آئے دعا نہیں پڑھ کے آئے
بہ باطن ہے وہ اک خاموش طوفان
ہوا میں ڈر کے پیروں سے چٹ جاٹیں
اندھیرے چاند اور سورج پہ چھا جاٹیں
”بڑے دھلگے“ میں تاروں کو پرو کر

بنالیتا ہے اک تسبیح شب کو عجب کچھ جنبشیں دیتا ہے لب کو
 کوئی لمبی دعا وہ مانگتا ہے خدا سے جلنے کیا وہ مانگتا ہے
 تو ڈر مجھ سے کہ ہے وہ پیر میرا وہی خجڑ ہے میرا تیر میرا
 نظر ڈالے جو تجھ پر خاک کر دے
 ترا اک پل میں قصہ پاک کر دے

معمر کے کفر و اسلام

وہ بولی وہ اگر ہے دوست تیرا عقیدہ اٹھ گیا اس پر سے میرا
 وزیر آغا اگر ایسا ہی ہوتا تو پھر وہ دوست کیا تیرا ہی ہوتا
 میں بولا پیر کو تکلیف کیوں دے تیرے لٹے میں خود ہی کیوں نہ لے لوں
 یہ کہہ کر ٹھسرا جاؤ کی پھٹیا اٹھالی میں نے ہاشم خاں کی لٹھیا
 جھپٹ کر اس نے یہ لٹھیا گرا دی پلٹ کر لات اک میں نے جمادی
 پیک کر اُس نے چھوڑے مجھ پر مکے ادھر سے بھی چلے کچھ تیرے میکے
 فرالی ہیں لے وہ مجھ پہ دوڑی چمک کر تمام لی میں نے ہتھوڑی
 مرے سینے پہ پھینکا اس نے حقہ "بول" کہہ کر دیا اک میں نے مکہ
 ادھر سے آیا اک بطح کا انڈا ادھر سے بھی "کندالی" اور ڈنڈا

ادھر سے "کس" کے پھینکے اُس نے آلو کیے بندے نے بھی "عاصر" کچالو
 مروڑی اس پر ی نے میری انگلی
 تو پیروں پر شکا دی میں نے "منگلی"

خوں ریز جنگ

بس اب دونوں نے رکھ دی طاق میں شرم ہوئے ہم دونوں آہوں کی طرح گرم
 جنوں ایسا اٹھا دونوں کے سر میں غضب کارن بڑا چوٹے سے گھر میں
 بڑی مٹہ زور ہاتھ پائیاں تھیں بڑی خوں ریز جنگ آرائیاں تھیں
 ادھر پائل بجی جھم جھم چمچم ادھر ٹیکے چلے دھم دھم دھما دھم
 مرا مٹہ آگے بڑھ کے اُس نے نوچا ادھر سے ٹیٹو امیں نے دبوچا
 جو میں نے ہاتھ زلفوں پر بڑھایا تو اس نے ہاتھ میرا کاٹ کھایا
 چلی لٹھیا کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ گرے آنسو پٹ پٹ پٹ پٹا پٹ
 چٹیں زلفیں فٹ فٹ فٹ فٹا فٹا پڑے تھڑ پٹا پٹ پٹ پٹا پٹ

اب "منگلی" پنجابی میں حمام دسے کو کہتے ہیں جس سے سالہ وغیرہ کوٹا جاتا ہے۔

قیامت کی ہوئی وہ "مارا ماری" گیا تمہرا اور اس کی ساری
 اگرچہ اس کی چٹھیں عرش پر تھیں مگر سب چوڑیاں اب فرش پر تھیں
 کبھی جو گال تھے ہلکے گلابی ہوئے اب تھپڑوں سے زہ خرابی
 جب اُس کو قہقام کہ چٹیا گھمایا بہت ہی اُس نے داویلا چمایا
 چٹھیں اس لیے پھلجڑیاں وہ پیاری
 کہ سکتے ہو گی شاعر پہ طاری

بہشت آنجا

حیثناؤں نے جھانکا بام و در سے نہ باہر آسکیں وہ میرے در سے
 مگر سن کر مسلسل ہاتے ہاتے پڑوسی جب وہاں گھبرا کے آئے
 کہا میں نے کہ بھاگو اور دو دانو نہ کو دو آگ میں اسے ہر بازو
 یہ کیوں تکلیف تم کرتے ہو زناہار! نہیں جھگڑا یہ ہم دونوں کا ہے پیار
 بڑوسی تم ہو میرے سکھ مجھے دو چلے جاؤ نہ آکر دکھ مجھے دو
 یہ کدو جیسے سر میں پیوڑوں گا یہ سارے جیسی ٹانگیں توڑ دوں گا
 کروں کر اپنی میرے گھر نہ آؤ بہشت اپنے محلے کو بناؤ

"بہشت آنجا کہ آزار سے نہ باشد کہے را با کسے کار سے نہ باشد"
 مجھے دیکھا اکھنوں نے مسکرا کر
 مٹا پھر چل دیے گردن جھکا کر

چار رکعت نماز فرض

اب اُس کا سر کوٹا یاد آیا مصلّا اُس نے رو رو کر بچایا
 اگرچہ تھقی تپش اُس دن بلا کی "نماز دوپہر" اُس نے ادا کی
 اٹھائے پھر دعا کو مر رہی ہاتھ بڑے ہی درد و کرب و رنج کے ساتھ
 مری سب یاد کر کے جھپٹیں یہ مانگیں اُس نے رو رو کر دعائیں
 "دعا یہ ہے اُسے ہیں مجھ پر جو ہاتھ ہنرور سے سے انہیں توڑے جھن تھن
 دعا یہ ہے مری اسے ذات باری چبا ڈالے اسے تارخ بخساری
 دعا یہ ہے مری اسے میرے مانک اسے لے جائے علم الدین سا لک
 دعا یہ مانگتی ہے تجھ سے بندی کہ لے بھانسنہ اسے انور کو بندی
 دعا یہ ہے کرے سند اس کا کالا وہی شہ نامہ اسلام والا

لے لے جگن ناتھ آزاد لے لے ابوالاثر حقیظ جہانند ہری

مجید امجد کا کتا اس کو کاٹے یہ رو رو کر کے پیچھے اُس کے چاٹے
 اسے یوسف ظفر رستے میں پیٹے اسے غابد غسلی غابد گھیٹے
 اثر صہبائی بھی آجائے جھٹ سے ٹکائے ایک ٹکائے اس کو کھٹ سے
 بہت گل نام راد شتام گھنٹی یہ کہہ کر بیٹھے ملتاز مفتی
 دعا ہے اُنک کے گھر جب بھی جائے وہاں وہ ہمارے دل سے اس کو پڑائے
 سمت پرکاش اسے ہندو بنائے بنارس جا کے یہ پٹیا بڑھائے
 اسے پھینکے برائے "نیک نامی" قلب مینار سے خوشتر گرامی
 بنے یہ کو چال ہانکے یہ ٹانگے رشتی پٹیا لوی سے بھیک مانگے
 نہ اس کو ظاہر نہ مخفی ہی چاہے وہ آکر پیٹ جائے گا بے گاہے
 پٹریں جو شش و عشرش ملیاں کہیں بناری پہ اتنی مسربانی
 وہ آئیں بن کے ڈاکو منہ پیٹے اسے کھا جائیں دونوں باپ بیٹے
 بلا سے گر وہ ویکی ٹیریں ہیں حقیقت ہے کہ دونوں ایریں ہیں
 دعا ہے اب اسے جلدی سورت آئے اسے پطرس بخاری آکے لے جائے
 نہ بہر تعزیت ہی کو لی آئے پھانزہ اس کا خود شیطان اٹھائے

یہ کتا ہے مرا ہر نہ خیم تازہ ہوں کتے ساتھ جب نکلے جوازہ
 کرے شیطان ہی تجھ سے نہ کھین کرے شیطان ہی تجھ سے نہ کھین
 پکارو اسے فرشتہ بل کے آئیں

میری مختصر سی دعا

ابھی جب وہ مصلے پر میں آیا خدا کے سامنے سر کو جھکایا
 دعا کو موٹے موٹے ہاتھ اٹھائے نہیں پر ایک دو آنسو گرائے
 کہا مالک سے اے دُنیا کے والی ترے در پر کھڑا ہے ایک سوالی
 ترا دربار ہے دربار عالی بھگا دینا نہ مجھ کو دے کے کالی
 یہ تیری ہی شریعت میں لکھا ہے کسی کو گالیاں دینا بُرا ہے
 میں ٹوٹے دل کا اکتارہ بجا کر تری رحمت کی گنڈی کھٹ کھٹا کر
 نہ جنت مانگتا ہوں اور نہ حوریں نہ کتا ہوں کہ دے عربی کجوریں
 نہ سونا اور نہ چاندی مانگتا ہوں میں تجھ سے انتخاب یہ کر رہا ہوں
 کہ جو بندی ترے در پر کھڑی تھی جو اپنی ناروا خند پر اڑی تھی
 ابھی مانگی ہیں جس نے سود عائیں سنائی ہیں تجھے جھوٹی صدائیں

تو اُس بندی کو اب ڈیکھت کر دے

دُعائیں اُس کی سب ریکھت کر دے

بہارِ آخر شد

وہ رشکِ ماہِ آگن میں کھڑی تھی رواں آنکھوں سے آنکھوں کی جھڑی تھی
رومال اُس کو دیا اک میں نے لا کر دیا پھینک اُس نے جو غصے میں آ کر
یکایک ہو گئی چپ روتے روتے کہ جیسے چوہا اٹھی ہو سوتے سوتے
سب آنسو آستیں سے پونچھ ڈالے جو باقی تھے وہ آنکھوں میں سنبھالے
دیے پانی کے چھینٹے مُنہ پر دوچار کیے خشک اپنے بھگے بھگے رخسار
لیے ہاتھوں میں کاجل اور سلاخی وہ پیش آئینہ اکھلا کے آئی
دیے آنکھوں میں جیکاجل کے دھارے چمک اُٹھے اُن آنکھوں کے ستارے
لگائے مُنہ پر پت پت پتھر کے دوچار لپ اٹک سے بنایا لب کو گلزار
سیہ زلفوں کی بدلی کو سنوارا دمک اٹھی وہ پھر سے ماہ پارا
وہ اک زخمی پری بن کے اٹھی تھی مقیامت سما منے میرے کھڑی تھی
ہزاروں بجلیاں برسا رہی تھی مگنا ہوں کو مری تڑپا رہی تھی
یہ جی چاہا کہ سینے سے رگالوں اسے پھر دل کی دھڑکن میں بنا لوں
مری نیبت کو اک دم پا گئی وہ مرے نزدیک ہمیں کر آ گئی وہ
یکایک عشق سے بے تاب ہو کر گری جھٹ سے مرے قدموں پر دو کر

یہ بولی رجم کیجے مجھ پر سرکار جہاں قافی نہیں قافی مرا پیار
میں اُبھی آپ سے بس ہو گئی بھول ہوا جو کچھ بھی اس پر ڈالیے دھول
نہ چاہوں آپ کو کیا ویش یا ہوں؟ زلی ہندی ہوں، نخرایشیا ہوں
ملا لیجے مگنا ہیں سُکرا کر بنا لیجے مجھے اپنا اکھٹا کر!
نشے میں جیت کے میں سُکرایا اُسے قدموں سے اپنے جھٹ اٹھایا
وہ بولی "دیکھیے کبیر پہ بلبل کہاں سے آ گئی ہے یہ بنا گل؟
جو بلبل دیکھنے کو سر اٹھایا میں چنیا "مرگیا رہے میں خدایا"
مرے معصوم سر پر ایک ڈنڈا
لگا یوں تھا، کہ میں اک دم تھا ٹھنڈا

آخری منظر

وہ بھاگی جھٹ سے اب گٹیا سی باہر لگا دتسر ڈالی اک پلٹ کر
لگی کہنے کہ "بس اب تجھ پر لعنت گئی چوٹھے میں سب تیری محبت"
یہ سننے میں تجھے ہٹسکا رہی ہوں میں دولت خاں کے گھرا بجا رہی ہوں
تو اس کٹیا میں بیٹھا شاعری کر میں جلیے جا رہی ہوں، تو یہیں مر
میں بولا "چاہے ناتے توڑتی جا یہ سر ٹوٹا ہوا تو جوڑتی جا

تو روئے جا رہی ہے اپنے دکھڑے رنجائے ہو گیا یہ کستے "کھڑے"
 وہ کہہ کہہ "چیر لو" مجھ سے یہ بولی "ترے پاس اب مری آتی ہے جوتی
 پیٹھ کو پیروہ غصے سے چل دی میں پیلا پڑ گیا جیسے کہ صدی
 کہ اسجدے میں اور بولا خایا "یہ کیسا دن مجھے تو نے دکھایا؟
 "زنِ خود رفتہ" باز آید کہ ناید بعدِ غزو نیاز آید کہ ناید

زنانِ بے شمار اندر جہاں اند

"زنِ بندہ نواز" آید کہ ناید

زند کے زند رہے

خانہ بہ مہمان گزاشت

گھر میں آیا ہے جو مہمان نہیں جائے گا
 لے کے جائے گا بری جان نہیں جائے گا
 رہ پڑا ہے یہ مرے گھر میں ہمیشہ کے لیے
 جب تلک جسم میں ہے جان نہیں جائے گا
 گالیاں دل میں ہزاروں اسے دی ہیں لیکن
 اس کو ہوتا نہیں عرفان نہیں جائے گا
 میں وہ یعقوب ہوں جو اس سے بچھڑنا چاہے
 یہ وہ یوسف ہے جو کنعاں نہیں جائے گا

وانے وانے پہ خدا نے ہے لکھا اس کا نام
 گھر میں جب تک ہے یہ سامان نہیں جائے گا
 ہم کہتے ہیں تو یہ کیوں ہے مکینہ یارب؟
 اب تو یہ تا حد امکان نہیں جائے گا
 اس کے والد کا یہ گھر ہے نہیں روحان بہار
 یہ رہے گا علی الاعلان نہیں جائے گا
 پاؤں نازک ہیں ترے ان کو نہ غصے میں چک
 یہ بت بے حس و بے جان نہیں جائے گا
 اس پہ آئے ہوئے غصے کو نہ بچوں پہ نکال
 پٹ کے ہو جائیں گے ہلکان نہیں جائے گا
 "اسیت انکر می نہ پڑھا اس پہ نہ گلا حول" ہی پھونک
 اس کا اللہ ہے نگہبان نہیں جائے گا
 آج رو رو کے گلے اس کے ملیں ہم دونوں
 میرا ذمہ تیرا ایمان نہیں جائے گا

کئی بار اس نے کنکھیوں سے تجھے دیکھا ہے

دل میں لے کر ترے ارمان نہیں جائے گا

اے مری سروِ خراماں اے مری حورِ جمال

تیری جنت سے یہ غلمان نہیں جائے گا

ہائے بے چارے کو تو کتنی پسند آئی ہے

اب تو دیدیگا یہیں جان نہیں جائے گا

دینے والا ہے یہ شاید تجھے شادی کا پیام

ترے ورے کسی عنوان نہیں جائے گا

سنگدل پیٹ نہ یوں مجھ کو میں سچ کہتا ہوں

گھر چلا جائے گا "دربان" نہیں جائے گا

نو کروں سے ابھی بندھواتا ہوں سامانِ ترا

یہ یونہی بے سرو سامان نہیں جائے گا

میں ہی چل دیتا ہوں گھر سے اسے تکلیف نہ ہو

چھوڑ کر یہ ترا "دامان" نہیں جائے گا

والدہ خالد و عرفان چلا جائے گا

"وارث خالد و عرفان" نہیں جائے گا

رو نہیں جان ادا ہونٹوں پہ لے آسکان

میں بھی اس گھر میں کبھی آؤں گا بنکر مہمان

ایک اور مہمان

بن کے آیا ہوں میں مہمان نہیں جاؤں گا
 سب کو کر دوں گا پریشاں نہیں جاؤں گا
 بیٹھ کر چین سے چھوٹوں گا تہاے سگریٹ
 پاک رہے ہیں ابھی پکوان نہیں جاؤں گا
 فوج ہوتی ہوئی مرغی کی صدا آتی ہے
 گھر میں دعوت کا ہے سامان نہیں جاؤں گا
 دوں گا میں مسجد مہمان نوازی میں اداں
 میں ہوں اک سچا مسلمان نہیں جاؤں گا

دل پہ میں جبر کیے صبر کیے بیٹھا ہوں
 لے کے میں بھوک کا طوفان نہیں جاؤں گا
 خشک لیں نظروں سے آخر مرا کیا بگڑے گا
 تم کو ہو جائے گا خفقاں نہیں جاؤں گا
 کھا رہا ہوں میں بنگا ہوں کے ہزاروں دھکے
 پھر بھی ہونٹوں پہ ہے مسکان نہیں جاؤں گا
 کیوں پکائی ہیں یہ سب چیزیں مزیدار لذیذ
 میرا ہر چیز میں ہے دھیان نہیں جاؤں گا
 مجھے کو معلوم نہ تھا اتنے سمنے ہو تم
 جاؤ جاؤ علی الاعلان نہیں جاؤں گا
 اتنا کھاؤں گا کہ آجائے گا غش تم سب کو
 تم کو کر دوں گا میں ہلکان نہیں جاؤں گا
 اے رذیلو! مجھے جانے کے اشارے نہ کرو
 جب تلک جسم میں ہے جان نہیں جاؤں گا

پونچھ لو آنکھوں میں آئے مجھے ہر آنسو کو

میں تو اب تاحد امکان نہیں جاؤں گا
خود ہی کہہ دو کہ ”اجی چائیے کھانا کھا کے“

ورنہ میں خود ہی مری جان نہیں جاؤں گا
”مدعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے“

راجندر بیدی اور چور

(۱)

رات تاریک ہے اور دیراں سڑک
یعنی کس لیے تم یہاں ہو کھڑے؟
پھر کھڑے اس طرح ہو کہ ہر اک نظر
بے شبہ تم پر مشکوک ہو کر پڑے
بال بکھرے ہوئے ہیں نگاہیں حزیں
سبح بتاؤ مجھے کیوں پریشان ہو؟
اپنے تھوڑے سے غم دوست مجھ کو بھی
مجھ سے تم کچھ چھپاتے مری جان ہو

(۲)

میں نے سن لی ہے سب داستانِ الم
ان ستاروں کی چھاؤں میں دل تھام کر
قصہ مختصر یہ کہ تم چور ہو
اس مکان پر ہے شاید تمہاری نظر

اس مکان کے بکس سے کئی سال سے
جب یہ مفلس تھا کتنی تھی دنیا سبھی
دولت آتے ہی سب سے اڑنے لگا
لوٹ کر اس کا گھر اس کا مال اس کا دھن
کہہ کے بسم اللہ اب ساتھ آؤ میرے
جو بھی چاہو گے اس گھر سے مل جائے گا
کھل گیا ایک جھنگے میں ٹھیر و ذرا
چپے چپے سے اس گھر کے ناقت ہوئیں
اند آ جاؤ چپکے سے اسے اجنبی
"صاحب خانہ جانے کدھر مر گیا
مقوڑی مقوڑی مری جان پہچان ہے
اے خدا کتنا اچھا یہ انسان ہے
پھر گئے اس کے دن بڑھ گئی اس کی "میں"
خاک میں ہم ملا دیں گے آج اس کی "ٹپیں"
توڑ دیں اس علی گڑھ کے تالے کو ہم
ہے یقین مجھ کو اس کا خدا کی قسم
ایک طے میں بجلی جلاتا ہوں میں
"مال اصلی کہاں ہے؟ بتاتا ہوں میں"
ہاں میں ہر طرف روشنی ہو گئی
آج تقدیر کم بخت کی سو گئی

(۱۲)

بھوک تم کو لگی ہے تو آؤ ادھر
دیکھو گھبراؤ مت خوب کھاؤ پیو
"صاحب خانہ" کی میز پر آتم ہیں
کبیر کی ڈش ہے یہ ساتھ چپے نہیں
بسکٹوں کا یہ ڈبا ہے یہ جام ہے
آج کی رات اس گھر کا نیلام ہے
یہ چھری بھی ہے کھاؤ انہیں کاٹ کر
صاف کر دو زباں سے اسے چاٹ کر

بس میاں کھا چکے؟ اچھا اچھا چلو
اے بیس اس گھر کی اب ہم تلامشی ذرا
سارے کمروں میں چاروں طرف گھوم کر
آج کم کر لیں فکر معاشی ذرا
(۵)

اے لوے لوجی پچیس سو نفٹ ہیں
اس کی جیبوں سے وقتاً فوقتاً کبھی
گیارہ تو لے گا ہے غالباً بار یہ
کھو لو الماریاں مجھ کو معاف ہے
یہ زمرہ کے جھکے، یہ ہیرے کے سیٹ
جب انہیں جیب میں رکھ کے چل دو گے تم
گرم یہ سوٹ ہاں ہاں چرا لو انہیں
جسم پر گرتا مارے نہ یہ فٹ ہوئے
کسی ایران کے بانگ ہی کی طرح
کر کے تھما اس کو بوری میں رکھ لو ذرا
اس کی بیوی نے شاید چھاپے تھے یہ
اس بچاری نے شاید اڑائے تھے یہ
تین تو لے کی شاید ہیں یہ یا لیاں
ان میں پچاندی کی ہیں تو عدد تھا یاں
نہنی نہنی یہ سونے کی انہیں بھی ہیں
پھر نہ باقی رہے گی بجائے کی "میں"
سرو یوں میں تھامے یہ کام آئیں گے
اچھی قیمت پر بیشک یہ بک جائیں گے
کس قدر خوبصورت یہ قالین ہے
نہ چرمانا اسے اس کی تو این ہے

(۶)

بھر چکی ہیں "ٹاناٹ" یہ سب بوریاں
کیا یہ چاروں کی چاروں اٹھاو گے تم؟

اتنا ہی خوش کرو گے مجھے آج تم
 حشر نہیں جتنی دل کی نکالو گے تم
 اور کچھ چاہیے؟ چھا اب جاؤ گے؟
 تم کو جلدی ہے پر مجھ کو جلدی نہیں
 میں تمہیں چھوڑاؤں گا کچھ دیر تک
 تم ہو محفوظ اے دوست رکھو یقین
 مجھ کو حصہ نہ دو بھاگ جاؤ بس اب
 دیکھ لے گا کوئی اور یہی ہے سحر
 ہو سکے گر تراب جاتے جاتے ذرا
 مسکرا کر مجھے دیکھ لو اک نظر
 نہیں جذبات کی رو میں اتنا ہو
 تم کو کافی ہے جو کچھ تمہیں مل گیا
 فکر میری کرو تم نہ اے مہرباں
 رات تاریک تھی اور ویراں سڑک
 مجھ کو کافی ہے جو کچھ ہے باقی یہاں
 میں کھڑا دیر تک اس کو نکلتا رہا
 تاروں کی چھاؤں میں دیر تک میرا دل
 میرے سینے میں دھک دھک دھڑکتا رہا
 کامیابی پر اپنی بہت خوش تھا "وہ"
 اس حقیقت سے بے چارہ انجان تھا
 مجھ سے اٹھو اے جو اس نے سر پر رکھا
 سب کا سب میرے ہی گھر کا سامان تھا

حساب دشمنانِ دل

(۱)

"سلا ماں لیکم! قسم خدا کی بہت ہی عمر آپ کی بڑی ہے"
 (صبح صبح توبہ توبہ توبہ نگاہ کس شوم سے لڑی ہے)
 "کھڑی ہیں کیوں آپ؟ بیٹھے ناگئے ہیں شاید ڈاکخانے"
 (نہیں وہ گھر میں تو اب کرے گی تو جلد جانے کے سو بہانے)
 "غضب کا حسن آج آپ پر ہے بھڑ میں کیا چند آہیں ٹھنڈی"
 (رنگا کے دنیا لہ دار کا جل تو ہو ہو لگ رہی ہے رنڈی)
 "پئیں گی کیا آپ روح افزا؟ نہیں! تو پھر کیا پیش کی جائے؟"
 (ترے ختم کا یہ گھر ہے شاید کہ جب بھی جی چاہا کھٹکے)
 ۲۴۹

"زبیدہ جلدی سے چائے لاؤ، یہ دیکھو تشریف لائیں آپا"
 (تمہاری باجی کی سوت آئی ہے اس کا آکر کروسیا پا)
 "مشین کیا چیز؟ میں تو حاضر کروں اگر آپ جاں بھی مانگیں"
 (مشین کیا تیرے باپ کی ہے؟ میں پیردن تیری دونوں مانگیں)
 "وہ چھ بجے شام کل ملیں گے! جی بچے آپ آسکیں گی"
 (دوپٹہ سرکا کے کل ہی آپ اُن کو اپنے نخرے دکھا سکیں گی)
 "سور کی بچی! حرام زادی! چھنال! "جی کون؟" بی رضیہ!
 (قسم خدا کی میں ایک دن تنگ آکے نموں کی سب قضیہ)
 "مگر رضیہ تو نام میرا نہیں جی وہ ایک دوسری ہے"
 (بہت دنوں سے چھنال میرے میاں کے پیچھے پڑتی ہوتی ہوا)
 "زبیدہ تو بہ کہاں گئی ہیں پھر، ذرا مری جان ادھر تو آنا"
 (رضیہ آپا کو اپنے پیا نو پہ اک کر وہ غزل سنانا)
 "زمانہ آبا ہے بے ججانی کا عام دیدار بار ہوگا۔۔۔"
 (کنوار یوں کا بیا ہتا مردوں کے ساتھ چپ چپ کے پیار ہوگا)

رند کے رند ہے

اے خدا! آج تجھ سے جو کہتا ہوں میں اس کا مطلب میں بالکل نہیں جانتا
 مجھ کو آتی نہیں ہے تری یہ بیاں اپنا یہ عجز میں کب نہیں مانتا
 جلدی جلدی دھوکے آیا ہوں میں سر پہ ٹوپی ہے اور ہاتھ بیٹنے پہ ہیں
 اور خیالات کے طائر "خفتہ پڑ" محو پرواز کتے مدینے پہ ہیں
 اچھی اچھی ہی بانیں یہ ہوں گی کوئی گو سمجھ میں مری کچھ بھی آیا نہیں
 قوم نے آیتیں تو سکھا دیں مگر ان کا مطلب کسی نے بتایا نہیں
 خالق دو جہاں! معذرت میری کیا! اس لیے پڑھ رہا ہوں نماز قضا
 رات کو دیر سے مجھ کو چھٹی ملی نصف شب سے نہ پہلے میں گھر آسکا

صبح آئی تھی بیوی جگانے مجھے پر اسے مجھ پر کچھ رحم سا آگیا
 بخش دیتا اسے وہ بڑی نیک ہے اس بچاری کو شیطان بہکا گیا
 دیکھ پھر میں نے اللہ اکبر کہا ہاتھ گھٹنوں پر رکھتے ہی سر جھک گیا
 جب کہا میری بیوی نے "جلدی پڑھو" تو خیالات کا سلسلہ رک گیا
 وہ بھی سچی ہے اے رازقِ دو جہاں! اس کو ڈر ہے کہ میں لیٹ ہو جاؤں گا
 نوکری لیٹ ہونے سے گر چھٹ گئی پھر غویبی کی فکر وہیں کھو جاؤں گا
 مرد پڑ جائے گا پھر سے جو لہا مرا میرے معصوم سب بھوکوں مر جائیں گے
 تو نے تھوڑا سا بھی گر تغافل کیا رازقِ دو جہاں وہ کہہ رہا تھا میں گئے
 ان کے آگے بھی سر کو جھکاتا ہوں میں تیری دنیا میں ہیں اور بھی کچھ خدا
 اے خدا رحم کر تو مرے حال پر میں نہ ان سے جدا اور نہ تجھ سے جدا

This book has been
 ended here

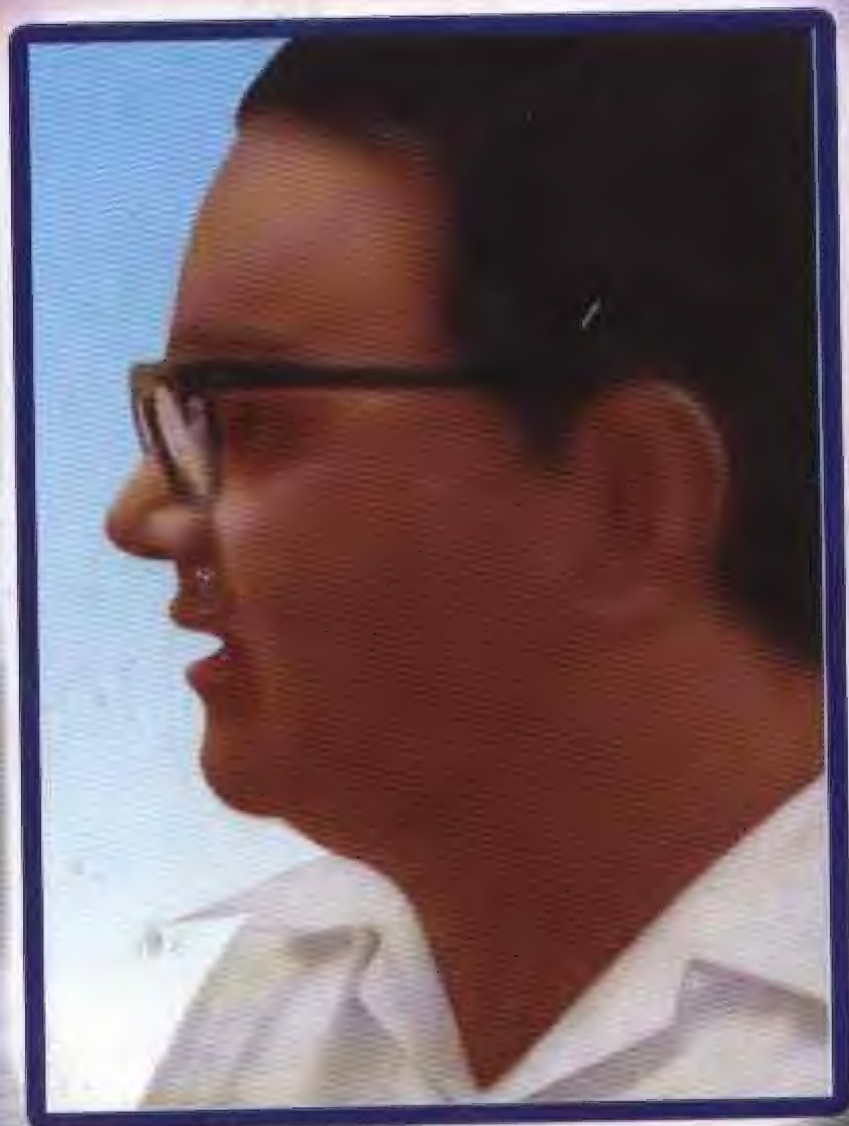
خط لکھیں گے

گرچہ مطلب.....!

(راجہ مہدی علی خاں کے خطوط کا مجموعہ)

ڈاکٹر عبد القدیر مقدر

راجہ مہدی علی خان کی ادبی خدمات



ڈاکٹر عبدالقدیر ہمدانی

Abdul Qadeer
Muqadar,
Dakkan

کچھ راجہ مہدی علی خاں کے بارے میں

۲۳ ستمبر ۱۹۱۵ء کو راجہ مہدی علی خاں وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ (پنجاب) پاکستان میں پیدا ہوئے۔ ان کی بیگم طاہرہ سلطانہ محنتی کے بیان کے مطابق وہ اپنے آبائی گاؤں کرم آباد میں پیدا ہوئے جہاں ان کے نانا کرم الہی بہت بڑے جاگیردار تھے۔ اور انہی کے نام سے یہ گاؤں ”کرم آباد“ موسوم ہے۔ زرخیز کمارشاد کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں راجہ مہدی علی خاں نے اپنے لڑکپن کی شرارتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

”مشن اسکول وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ کے ماسٹروں سے پٹ پٹا کر اور پونے دو میل پیدل چل کر اپنے گاؤں میں واپس آرہے تھے کہ گاؤں کی قریبی سڑک پر میری پھوپھی زاد بہن دوڑتی دوڑتی ہانپتی کانپتی آئی اور کہنے لگی۔ آج آپ لوگوں کی خیر نہیں، دونوں ماموں جان چھڑیاں لے کر آپ کے خیر مقدم کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔“

راجہ مہدی علی خاں کا تعلق علمی گھرانے سے تھا۔ آپ کے والد عنایت اللہ خاں نہ صرف شعر فہم تھے بلکہ خود بھی شعر کہتے تھے۔ والدہ حبیبہ خانم بہت ہی مقبول صاحب دیوان شاعر تھیں۔ ان کا قلمی نام ج۔ ب صاحبہ تھا۔ علامہ اقبال نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ ”مشرقی خواتین میں یہ ایک مقبول شاعرہ ہے۔“ ”نوائے حرم“ ان کا مجموعہ کلام کافی مشہور ہوا۔ ان کے چار بھائی اور ایک بہن، ز۔ ب۔ صاحبہ مشہور افسانہ نگار تھیں۔ اس طرح راجہ مہدی علی خاں کے ایک ماموں مولانا ظفر علی خاں شعلہ بیاں خطیب، بلند پایہ شاعر اور ایک اعلیٰ درجہ کے مسلمہ ادیب و مترجم تھے۔ وہ ایک سیاست داں اور مجاہد آزادی تھے۔ لاہور اور پنجاب بلکہ پورے ملک میں مدت تک ان کا طوطی بولتا رہا۔ روزنامہ ”زمیندار“ کے ایڈیٹر اور طنز و مزاح کے نامور ادیب شاعر تھے۔ وہ نہایت ہی بے باکی کیساتھ انگریزی حکومت پر طنز کیا کرتے تھے۔ جس کے نتیجہ میں متعدد بار قید و بند کے مصائب بھی جھیلے، اخبار کی ضمانتیں بھی ضبط ہوئیں۔ زمیندار کے علاوہ وہ دکن ریویو اور ستارہ صبح کے بھی ایڈیٹر تھے۔ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۶ء میں اپنے گاؤں کرم آباد میں انتقال کر گئے۔ ڈاکٹر فکیل الرحمن ڈی۔ لٹ کے ایک خط میں راجہ صاحب لکھتے ہیں:-

”مولانا ظفر علی خاں مرحوم ایڈیٹر اور مالک اخبار

”زمیندار“ لاہور، حامد علی خاں سابق ایڈیٹر ”ہمایوں“

لاہور، حمید احمد خاں صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور

تینوں میرے ماموں ہیں جنہیں انداز بیاں اور ”کے ریویو

کے سلسلہ میں“ ”نصرت“ (ماہنامہ پاکستان) والوں نے میرا بھائی لکھا ہے۔ حمید احمد خاں پندرہ سال سے غالب پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں جو شاید اب تک پوری نہیں ہوئی۔ محترمہ ج۔ ب صاحبہ میری والدہ ہے۔ (والد صاحب دو برس ہوئے پاکستان میں انتقال کر گئے) اُن کی نظموں کا مجموعہ ”نوائے حرم“ شائع ہو چکا ہے۔ دس پندرہ برس سے کہنا اور لکھنا بند کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم ان کی شاعری کے بہت ثنا خواں تھے۔ محترمہ ز۔ ب صاحبہ کے افسانوں نے آج سے بیس پچیس سال پہلے دنیائے ادب میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ وہ میری خالہ ہیں۔ اور پاکستان میں ہیں۔ جب میں ”پھول“ اور ”تہذیب نسواں“ ایڈٹ کرتا تھا۔ اس وقت میری عمر شاید بیس برس ہوگی۔“

راجہ مہدی علی خاں کے ایک بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ راجہ صاحب کے چھوٹے بھائی عثمان علی خاں پہلے ریلوے میں ملازم تھے پھر انہوں نے اپنی ملازمت ترک کر کے ”محزن“ جاری کیا جو اپنے وقت کا مقبول پڑچہ تھا۔ راجہ صاحب کی بڑی بہن عذرا خانم بھی شعر کہتی تھیں ان کے شوہر ایک کامیاب بزنسمن تھے۔ سلمیٰ خانم خالدہ خانم اور زبیدہ خانم جو

عثمان علی خاں کے بعد پیدا ہوئیں۔ سبھی کو علمی شغف تھا اور سبھی شعر فہم اور شاعر تھیں۔ اس طرح راجہ صاحب کا تنہیال اور داد یہال دونوں گھرانے تعلیم یافتہ علم و ادب کے رسیا تھے۔ جس میں راجہ کی پرورش ہوئی۔ خود ان کے بیان کے مطابق ابتدائی تعلیم مشن ہائی اسکول وزیر آباد میں ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور سے ایف۔ اے کیا۔ زمانہ طالب علمی سے صحافت سے لگاؤ رہا اور ”پھول“ نامی رسالے میں انگریزی اور دیگر زبانوں کی کہانیاں اور مضامین کے ترجمے جو راجہ صاحب لکھا کرتے تھے شائع ہوا کرتے اور شعر گوئی ورثہ میں پائی تھی لڑکپن ہی سے شعر کہا کرتے تھے خود اپنے بارے میں کہتے ہیں۔

”ان ستم ظریف بزرگوں نے درختوں کے وہ چار چار پانچ

پانچ ٹہنے رسیوں کی مدد سے ہماری کمر کے ساتھ باندھ کر

ہمیں ہندوستان کا نمائندہ پرندہ یعنی مور بنایا اور حکم دیا کہ

دوڑ دوڑ کر آنگن کے گیارہ راونڈ لگاؤ۔ جب ہم نے

عورتوں اور بچوں کی طرف نکلیوں سے دیکھ کر ذرا پس و

پیش کی تو لاتوں، مکوں اور گالیوں سے ہماری تواضع شروع

ہو گئی اور مجبوراً ہمیں حکم کی تعمیل کرنی پڑی..... لیکن میں

نے سوچا..... راجہ مہدی علی خاں اپنی خفت مٹانے اور

بے عزتی پر صبر کرو۔ آنسو نوش کر جاؤ ہر مکے پر باہر چھڑی

کے وار پر فاروق علی خاں (چھوپی زاد بھائی) کی طرح

”ہائے میں مرا“ کہنے کی بجائے ناچو اور قہقہے لگاؤ۔ چنانچہ

میں نے خوب قہقہے لگائے اور ”آنگن میں چورنا چیں“

گاتا رہا..... اس عمر میں بھی میں نے مور اور چور کے

قوافی کی پابندی سے اپنے فطری شاعر ہونے کا ثبوت

دے دیا تھا۔“

اس طرح راجہ صاحب کی پہلی نظم اسی حادثہ کا نتیجہ تھی۔ وہ بچپن میں بہت شریہ اور نٹ کھٹ تھے۔ ان کی شرارتوں میں بھی مزاح کا پہلو ہوا کرتا تھا۔ بچپن کی اس پٹائی کے بعد جو نظم ”بزرگوں کے مظالم“ کی صورت میں وجود میں آئی۔

”بچوں پہ ظلم کرلو قیامت قریب ہے

اب حد سے تم گزر لو قیامت قریب ہے

اک دن فرشتے تم کو بھی پٹینگے گرز سے

یہ بات یاد کر لو قیامت قریب ہے

ہم کو لگے گی بھوک تو تربوز کھائیں گے

تم جاؤ بھوکوں مر لو قیامت قریب ہے

اور اسی طرح نظم کے آخر میں میری شاعری قدرے آزاد ہو گئی تھی اور اسے میں نے

کچھ اس طرح ختم کیا تھا۔

یوں پیٹ پیٹ ہم کو بنایا ہے تم نے مور

یوں آسمان کے نیچے مچایا ہے تم نے شور
دنیا کے سامنے کہا ہم کو حرام خور....!
تربوز کھائیں گے اجی ہم تو نہیں ہیں چور
پیروں پہ سر کو دھر لو قیامت قریب ہے

راجہ مہدی علی خاں نے انی نظموں میں کوئی تخلص استعمال نہیں کیا۔ شاذ و نادر ہی اپنا
پورا نام استعمال کیا۔ بیشتر نظمیں بغیر تخلص ہیں۔ جب زرش کمار شاد نے راجہ صاحب سے ان
کے قلمی نام ”تخلص“ سے متعلق استفسار کیا تو کہنے لگے کہ

”میں نے اپنے لئے کوئی تخلص کیوں نہیں تجویز کیا؟ کون
کہتا ہے کہ نہیں کیا؟ بچپن میں رسوا کیا تھا۔ لیکن بزرگ
لوگ کہنے لگے کہ یہ تو غنڈا ہے۔ ان کے طنزیہ و مزاحیہ
فقروں سے جب میرا دل زخمی ہونے لگا تو میں نے گھائل
تخلص رکھ لیا۔ والد صاحب جو خود بھی بغیر تخلص کے شاعر
تھے یہ کہہ کر میرے اس نئے تخلص کی کھلی اڑانے لگے۔

”راجہ جی گھائل ہو گئے ہیں انہیں ہسپتال پہنچانا چاہیے۔“
میں تنگ آ کر ایک دن مسرور تخلص رکھ لیا۔ لیکن اسی دن
ایک بزرگ نے مجھے پیٹ ڈالا۔ اور میں نے غصہ میں
آ کر اپنا تخلص ہی غمگین رکھ لیا دو مہینے تک میرا تخلص غمگین

ہی رہا۔ ایک دن دوستوں نے مذاق اڑایا کہ جس شاعر کا
تخلص ہی غمگین ہو وہ مزاحیہ نظمیں کیسے لکھ سکتا ہے۔ غصہ
میں آ کر میں نے قسم کھائی کہ اب کوئی تخلص نہیں رکھوں گا۔
جب سے بے تخلص ہی چلا آ رہا ہوں۔“

یوں تو راجہ مہدی علی خاں کی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا۔ وہ ”پھول“ اور
”تہذیب نسواں“ ایڈٹ کیا کرتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ لیکن شاعری
انہوں نے آٹھ سال ہی کی عمر سے شروع کر دی تھی۔ ڈاکٹر شکیل الرحمن کے موسومہ ایک
مکتوب میں لکھتے ہیں۔

”جی ہاں! میں وہی راجہ مہدی علی خاں ہوں جو کسی زمانے
میں ”پھول“ اور ”تہذیب نسواں“ ایڈٹ کرتا تھا۔ پرچوں
میں میرا نام نہیں تھا۔ لیکن ایڈٹ میں ہی کرتا تھا۔ میں نے
آٹھ سال کی عمر میں شعر کہنے شروع کئے۔“

ان کے علاوہ راجہ صاحب زمیندار اور نیرنگ خیال سے بھی وابستہ رہے۔ وہ ایک
کامیاب مترجم تھے۔ مختلف زبانوں کے دلچسپ افسانے اردو میں منتقل کرنے میں راجہ
صاحب کی نمایاں خدمات ہیں۔ ان دنوں ان کے منتخب اور ترجمہ کئے گئے افسانوں کی بڑی
سٹاکش اور پذیرائی ہوا کرتی تھی اور وہ اس طرح کافی مقبول ہو چکے تھے۔ ”نیرنگ خیال“ لاہور
نہایت معیاری پرچہ تھا اس کے ایڈیٹر حکیم محمد یوسف حسین تھے۔ دہلی کے نامور جرنلسٹ

سمت پر کاش شوق کے موسومہ خط میں وہ لکھتے ہیں۔

”آج کل“ کے ادارے میں جو لوگ ہیں ان سے غیر

مطبوعہ کلام یا مضمون ”نیرنگ خیال“ کے چالیس سالہ نمبر

کے لئے حاصل کر سکتے ہیں۔ میری طرف سے سلام اور

درخواست کیجئے گے وہ اس عظیم الشان نمبر کے لئے کچھ

ضرور دیں..... یہ تکلیف اس لئے دے رہا ہوں کہ

آپ دہلی میں ہیں..... اس کیلئے میں بھی ممنون رہونگا

اور راجہ مہدی علی خاں صاحب بھی اس سے راجہ صاحب

کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۹۴۲ء میں راجہ مہدی علی خاں نے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اسٹاف آرٹسٹ کی

حیثیت سے کام کیا اور بچوں کے پروگرام کے علاوہ فوجی بھائیوں کے پروگرام ترتیب دیا

کرتے تھے۔ یہیں ان کی ملاقات ن۔م۔راشد، میراجی اور اختر الایمان سے ہوئی۔ ن۔

م۔راشد شعبہ کے انچارج تھے۔ اختر الایمان نے بتایا۔

”ریڈیو پر میں اور بہت سے کاموں کے علاوہ لسنر

Listener ”آواز“ جس میں ریڈیو کے پروگرام چھپتے

تھے۔ اس کے لئے ترجمہ اردو میں کرنا بھی میرے کاموں

میں سے ایک کام تھا۔ وہیں میری ملاقات راجہ سے ہوئی۔

وہ میرے ذاتی دوست تھے۔ وہ ۱۹۴۶ء میں بمبئی آ گئے

تھے اور میں اس کے بعد بمبئی آیا۔“

۱۹۴۶ء میں سعادت حسن منٹو کی دعوت پر وہ بمبئی چلے آئے۔ اور ”فلستان لمپیڈ“

فلم کمپنی میں بحیثیت ڈائریکٹر کام شروع کیا۔ طبیعت میں چونکہ شاعرانہ رنگ تھا وہ

زیادہ دنوں اس کام سے جڑے نہ رہ سکے۔ پھر انہوں نے فلموں کے لئے گیت لکھنا شروع

کیا۔ ۱۹۶۳ء میں فلم ”آٹھ دن“ کیلئے پہلی بار انہوں نے گیت لکھے۔ اور اسی فلم میں چار مے

چہرے بطور ایکٹرز پیش کیئے گئے تھے ان میں راجہ مہدی علی خاں، سعادت حسن منٹو، محسن

عبداللہ اور اوپندر ناتھ اشک اس فلم میں راجہ صاحب نے ہیر و اشوک کمار کے بہنوئی کا کردار

ادا کیا تھا۔ یہ پہلی اور آخری فلم تھی جس میں انہوں نے اداکاری کی تھی۔ اسکے بعد وہ مستقل

فلموں کے لئے گیت لکھنے لگے۔ ۱۹۴۷ء میں فلم ”دو بھائی“ کے لئے گیت لکھے اور مقبولیت

حاصل کی۔ ان کی آخری فلم ”میرا سایہ“ تھی۔ راجہ مہدی علی خاں کا یہ عروج کا زمانہ تھا۔

انہوں نے ۱۹۴۶ء تا ۱۹۶۶ء پورے بیس سال فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ قیام بمبئی کے دوران

انکی شادی فرخ آباد ضلع فتح گڑھ کے نواب محمود علی خاں کی سب سے چھوٹی صاحبزادی طاہرہ

سلطانہ سے ہوئی۔ اس وقت وہ بہت ہی کم عمر تھیں آٹھویں کلاس پاس کیا تھا۔ طاہرہ سلطانہ

نے شادی کے بعد محض تخلص اختیار کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں۔

”ادب کے میدان میں وہ طاہرہ سلطانہ محضی کے نام سے مشہور ہیں اور شاید ہندوستان اور پاکستان میں وہ واحد

ہستی ہیں۔ جو راجہ مہدی علی خاں کی طنزیہ یلغار کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔“

حسن اتفاق طاہرہ سلطانہ محقی کا گھرانہ بھی علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ طاہرہ سلطانہ کے دادا محمد علی خاں رئیس فتح گڑھ تھے اور نانا محمد اسماعیل جج تھے۔ تنہیال لکھنؤ کا مشہور خاندان تھا۔ ان کے ایک خالو سر قاضی عزیز الدین احمد وزیر تھے۔ دوسرے خالو نواب معشوق یار جنگ بہادر صاحب تصنیف و تالیف (انہوں نے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز پر سوانح تاریخ جیبی کا ترجمہ کیا۔) حیدر آباد (دکن) میں کمشنر تھے۔ ایک اور خالو مظہر الحق اپنے زمانے کے مشہور بیرسٹر تھے۔ جن کے ڈرائینگ روم کی تعریف مہاتما گاندھی نے کی تھی۔ اور ان کے نام کے ڈاک ٹکٹ بھی جاری ہوئے تھے۔ طاہرہ سلطانہ محقی کی دو بڑی بہنیں ہیں۔ بڑی بہن شاہدہ محمود جن کے شوہر سید حبیب الدین صدیقی انعام دار آف کلس (پونہ) تھے۔ جو انگریزی اخبار ”ہیرالڈ“ سے وابستہ تھے۔ ان کے دو لڑکے ہیں وقار فاروقی عرف خالد جنہیں راجہ صاحب بے حد چاہتے تھے۔ انہوں نے آخری دنوں میں راجہ صاحب کی بڑی خدمت کی۔ دوسرے لڑکے جمیل فاروقی۔ طاہرہ سلطانہ کی دوسری بہن صابرہ محمود حیدر آباد (دکن) بیاہی گئیں۔ ان کے صاحبزادے عین الحبیب عرف الشمس جنہیں پیار سے عینی بھی کہہ کر پکارتے ہیں اپنے خالو راجہ مہدی علی خاں کی طرح فلمی دنیا میں مصروف ہیں۔ طبیعت اور مزاج میں راجہ صاحب کی جھلک نظر آتی ہے۔ بڑی بہن شاہدہ محمود طاہرہ سلطانہ محقی کے ساتھ بمبئی میں مقیم ہیں۔ طاہرہ سلطانہ محقی کا بچپن رام نگر ضلع نئی تال میں گزرا۔ شادی کے بعد انہوں نے

میٹرک کی تکمیل کی۔ راجہ مہدی علی خاں اپنی بیگم طاہرہ سلطانہ محقی سے بیحد محبت کرتے تھے۔ ان سے انہیں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ جس کا انہیں خلق تھا۔ تاہم انہوں نے اس کا غم نہیں پالا۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا۔

”..... پھر یکا یک کرسیوں، میزوں، بستروں، دروازوں اور کھڑکیوں میں سے رنگ رنگ کی بلیاں برآمد ہونے لگیں۔ یہ سب بلیاں راجہ صاحب اور طاہرہ سلطانہ نے پال رکھیں ہیں اور ان کے گھر میں بچوں کی کمی کو پورا کرنے کی ایک دلفریب کوشش ہے۔“

ایک زندہ دل اور خوش دل انسان کو قدرت نے اولاد کی خوشی سے محروم رکھا تھا لیکن اس خوشی کی تکمیل کے لئے راجہ صاحب نے اپنے دوست احباب اور ملنے جلنے والوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو اور بالخصوص اپنا بیچ و معذور بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پیار کرتے تھے۔

بقول کرشن چندر

”یوں تو راجہ بہت نیک دل انسان تھا۔ انتہائی خاموشی سے اپنے غریب دوستوں، بیواؤں اور یتیموں کی مدد کرتا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتا تھا۔ دستور کے خلاف اُس نے آج تک اپنے کسی دوست کی کاٹ نہیں کی۔ غیبت اور تکڑم سے اُسے سخت نفرت تھی۔ اپنے اچھے

دنوں میں وہ کبھی مغرور نہیں ہوا اور بُرے دنوں میں کبھی تنگدل نہ بنا۔ غرض کہ اس طرح کی اور بھی بہت سی برائیاں مرحوم میں تھیں جو موجودہ زمانے میں کسی بھی انسان کو کامیاب بننے سے روک سکتی ہیں۔ مرحوم کو اپنی زندگی میں جو کچھ ملا۔ اس نے اسے دونوں ہاتھوں سے اپنی زندگی ہی

میں لٹا دیا۔“ ۱

ان دنوں راجہ صاحب کی دوسری شادی کی افواہ پھیلنے لگی۔ حالانکہ نہ تو انہوں نے کوئی دوسری شادی کی اور نہ کسی سے معاشقہ کیا۔ وہ ہر کسی سے نہایت خوش دلی سے ملتے تھے خواہ عورت ہو یا مرد۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی میں خوش تھے۔ اولاد سے محرومی کے باوجود وہ اپنی بیگم طاہرہ سلطانہ سے کوئی شکایت کی اور نہ مقدر سے شکوہ کیا۔ وہ اپنی ماں بھائی بہنوں اور رشتہ داروں سے جو پاکستان میں تھے تقسیم کے بعد گویا ایک طرح سے کٹ سے گئے تھے۔ صرف خط و کتابت جاری تھی پھر یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا تھا۔ رام لعل کے استفسار پر اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”لاہور میں میری والدہ، بہنوں اور بھائی کے علاوہ بیسوں قریبی عزیز ہیں۔ کسی کا خط نہیں آیا۔ میری والدہ بہنیں اور بھائی تو مجھ سے متنفر نہیں ہیں، تو بہ کرو۔ کان پکڑو ایسی باتیں جلدی میں مت سوچا کرو۔“ ۲

نام کی مناسبت سے راجہ مہدی علی خاں کے مسلک سے متعلق لوگ غلط فہمی کے شکار ہوتے ہیں جب میں نے بیگم راجہ مہدی علی خاں سے استفسار کیا تو کہنے لگیں۔

”راجہ“ کا لفظ اس لئے اپنے نام کے ساتھ جوڑ

لیا تھا کہ کسی خاندانی بزرگ نے بتایا تھا کہ ان کے آباؤ اجداد کا سلسلہ نسب کسی راجپوت راجہ سے جاملتا ہے۔ جبکہ ان

کے والد عنایت اللہ خاں یا ان کے چھوٹے بھائی عثمان علی

خاں نے کبھی اپنے نام کے ساتھ راجہ کا استعمال نہیں کیا۔

والد نے ان کا نام مہدی علی خاں رکھا تھا یعنی ”مہدی“

بمعنی ہدایت کرنے والا کی رعایت سے۔ راجہ صاحب کا

مسلک ”حنفیہ سنی“ ہے۔ وہ اکثر جمعہ کو ماہم کی درگاہ

حضرت خطب کوکن شیخ علی بابا مخدوم فقہیہ مہاوتمی رحمۃ اللہ

علیہ پر حاضری دیا کرتے تھے۔“ ۳

راجہ مہدی علی خاں بھاری بھر کم جسم کے مالک تھے۔ گول رعب دار چہرہ۔ گھنے کالے بال، کشادہ پیشانی اور گہری آنکھیں ابرو سیاہ چمکدار کشادہ سینہ تھا۔ آخر دنوں میں انہیں ذیابیطیس کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ بظاہر وہ صحت مند دکھائی دیتے تھے۔ جسم میں پانی بھر جایا کرتا تھا۔ بہترے علاج کروایا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ حکیموں کے نسخے اور تجویز کردہ ادویات استعمال کرتے۔ کسی نے پانی میں چونا ملا کر پینے کا مشورہ دیا کہ ذیابیطیس کے لئے مفید ہے۔

چنانچہ وہ چونا ملا ہوا پانی پینے لگے۔ جس کے نتیجے میں ان کے گردے خراب ہو گئے۔ انہیں ماہم ہسپتال میں شریک کر دیا گیا۔ ان دنوں گردوں کا عصری علاج نہ تھا۔ اذیت ناک تکلیف سہتا ہوا ہنستا ہنساتا یہ عظیم انسان آخر کار ۲۷ جولائی ۱۹۶۶ء کی صبح اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت راجہ صاحب کی عمر کوئی پچاس برس تھی۔ جب ریڈیو سے یہ خبر نشر ہوئی تو لوگوں کا اثر دھام ان کے گھر پالی ناکہ پر جمع ہو گیا۔ سرشار سیلانی اس وقت کے مشہور شاعر اور ڈائلاگ رائیٹر تھے۔ راجہ صاحب کے سانحہ پر جو دردناک منظر دیکھ کر فی البدیہہ کہا۔

تھکا ماندہ مسافر سو رہا ہے زمانہ کیا سمجھ کر رو رہا ہے

بقول پریم جی پروڈیوسر (میرا سایا) کہ

”ایک بہت بڑی شخصیت ہمارے درمیان سے چلی گئی۔

اگر وہ حیات ہوتے تو شاید اور بھی ادبی کارنامے وجود میں

آتے۔“

راجہ مہدی علی خاں کے انتقال کی خبر نے ادبی دنیا میں غم و اندوہ کی ایک ایسی فضاء پیدا کر دی کہ دنیائے ادب کے ہر شاعر و ادیب نے اپنے رنج و ملال کا اظہار کیا۔ یہاں چند ادیب و شعرا کے قطعہ تاریخیں اور تاثرات درج کئے جاتے ہیں جس سے راجہ صاحب کی عظمت اور وقعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

”بیسویں صدی“ نے یہ اندوہناک خبر صفحہ اول پر اس طرح

شائع کی۔ ”ہندو پاک میں ایکساں طور پر مقبول و ہر دل عزیز

نامور ادیب و شاعر اور طنز نگار اردو کے عظیم المرتبت اور تاریخ ساز صحافی اور شاعر مولانا ظفر علی خاں کے حقیقی بھانجے اور پاکستان کی نامور شاعرہ محترمہ ج۔ب۔ صاحبہ کے فرزند و لبند راجہ مہدی علی خاں ۲۷ جولائی ۱۹۶۶ء کی صبح ۳ بجے ماہم ہسپتال بجلی میں انتقال کر گئے۔ اور اس اندوہناک حادثے سے ہندو پاک دونوں ممالک کے ادبی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ مرحوم کی ۸۰ سالہ بوڑھی والدہ اپنے لال سے ہزاروں میل دور لاہور میں خون کے آنسو رو رہی ہے۔ بد نصیب ماں اپنے بیٹے کی آخری بار صورت بھی نہ دیکھ سکی۔“

(بیسویں صدی اکٹوبر ۱۹۶۶ء)

اختر واصفی گوجرانوالہ مغربی پاکستان نے قطعہ تاریخ یوں لکھی۔

تواریخ وقات طوئی ہند مہدی علی

۱۹۶۶

ارگلشن پبلیشرز واصفی

۱۹۶۶

دل پہ اختر کے ہوا کیا مرگ مہدی سے اثر کیا تباؤں جھکو میں اے خوشتر اندوہ گیں

ہائے وہ رنگیں نوا شاعر ادیب زندہ دل
جس کا ثانی ڈھونڈنے سے بھی نہ پائینگے کہیں
کوئے حاسد کی اس کو کھا گئی دالے نظر
بزم یاراں کی ابھی کل تک وہ رونق تھا یہیں
آج ”آوازِ حزیں“ سے کہد یا ہاتھ نے یہ
”ہو گیا مہدی علی خاں عازم خلد بریں“

۱۸۷۶ + ۹۰ = ۱۹۶۶ء

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے مضمون ”اُردو ادب کا فنا ڈو“ میں راجہ مہدی علی خاں کو
”فنا ڈو“ قرار دیا جو سرکس میں ایک جوکر تھا وہ اپنے سینے میں ہزاروں غم لئے لوگوں کو ہساتا جو
اس کا پیشہ تھا۔ راجہ صاحب بھی اپنے اندر درد و کرب لئے زندگی بھر لوگوں کو ہساتے رہے۔
لکھتے ہیں۔

”اس دنیا میں جو بھی دارد ہوتا ہے اپنا مشن اپنے ساتھ لے
کر آتا ہے۔ بعض لوگ انسان کو جہالت اور تاریکی سے
اور بعض اسے دکھوں اور آرزوؤں کے چنگل سے رہائی
دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر بعض ایسے بھی ہیں جو
انسان کو اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنے کی تحریک دیتے
ہیں۔ اور یہ ایک بڑا مشن ہے۔ لیکن ایک بالکل محدود تعداد
ایسے لوگوں کی بھی ہے جو کوئی حکیمانہ یا پیغمبرانہ مقصد لے
کر وارد نہیں ہوتے۔ اُن کا کام فقط اتنا ہوتا ہے کہ وہ آگے
بڑھ کر بڑی آہستگی سے انسان کی آنکھوں سے بہتے ہوئے

آنسوؤں کو پونچھ ڈالتے اور اسے ڈرا سا گدگدا کر زندگی
کے سرخچاک اندھیروں پر مسکرانے کی سکت عطا کر دیتے
ہیں۔ راجہ مہدی علی خاں اسی گروہ کا ایک نامور فرد تھا۔۔۔۔۔
اس مختصر سے مضمون میں راجہ مہدی علی خاں کے فن کی
خصوصیات کو پیش کرنا مقصود نہیں۔ مقصود صرف اس کے فن
کا اعتراف ہے۔ وہ بیسویں صدی کی اُردو شاعری میں طنز
و مزاح کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ اور روتے ہوؤں کو
ہسانا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ مگر آج کہ وہ یکا یک ہمیں
اپنے آخری مذاق کا ہدف بنا کر کسی چور دروازے کے
راستے بھری بزم سے غائب ہو گیا۔“

نریش کمار شاد نے مظلوم خراج پیش کیا۔ جو بیسویں صدی کے صفحہ اول پر راجہ
صاحب کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا تھا۔
خوشتر نے سچ کہا صبح راجہ کی موت سے
مرجھا گیا ہے باغِ طرافت کا ایک پھول
دل پاش پاش ہے تو کلیجہ ہے داغ داغ
اُس کی مفارقت کو کہاں تک روئے
مُکھل ہو گیا ہے طہر کی محفل کا اک چراغ
جیل ملک کے مظلوم تاثرات ”اوراق“ پاکستان نے شائع کیا۔
ہم فریاد کریں یا گھائل دل کو شاد کریں
پتے لب اور روتی آنکھیں تجھ کو یاد کریں

دوزخ کو جنت میں ملایا، تو نے تو سکھ پایا
اندر مرنے کی تیاری باہر دنیا داری
اپنی ذات پہ ہنس لینے سے رنگ اگر کٹ جائیں
ظفر بھی یم۔ اے۔ نے قطع تاریخ لکھی۔

اُسے ہر طرف ڈھونڈتی ہے نگاہ
بڑی ورد انگیز و غمناک ہے

۱۹۶۶ء

رام لعل نے راجہ مہدی علی خاں کے سانحہ ارتحال پر ایک طویل مضمون اپنی کتاب
”درپچوں میں رکھے چراغ“ میں لکھا ہے۔ تاہم تعزیتی پیام کا حصہ یوں ہے۔ جو بیسویں
صدی نومبر ۶۶ء میں شائع ہوا۔

”روتوں کو بے دریغ ہسانے والا وہ خوش باش، خوش طبع،
خوش خلق اور خوش خور انسان آج زمین کی کتنی تہوں کے
نیچے پڑا ہوا ہماری بے بسی پر قہقہے لگا رہا ہوگا اور مصنوعی غصے
سے کہہ رہا ہوگا۔“ جاؤ میں تم میں سے کسی سے نہیں بولتا۔
آج ہماری بول چال کا فل اسٹاپ!!

کرشن چندر نے لکھا۔

”اُس کی اُونچی بے باک و معصوم ہنسی یاد آتی ہے۔ اُس کی

قسطا سی کی حد تک پہنچی ہوئی ظرافت نگاری اور کھلنڈرا پن۔
وہ ایک بچہ تھا ابھی اور جب موت کسی بچے کو ہمارے بیچ
میں سے اُٹھا کر لے جاتی ہے تو اس کائنات کی معصومیت
میں ضرور کہیں پر کوئی کمی ہو جاتی ہے۔“

(بیسویں صدی نومبر ۶۶ء ص ۹۳)

ریس مینائی نے منظوم خراج پیش کیا ہے۔

آشفگان زیست کا چہرہ اُتر گیا
جور ہسپار مسلک اخلاص و عشق تھا
بزم سخن سے آج وہ اہل ہنر گیا
وہ کیا ڈریگا قبر کی تاریکیوں میں بھی
راہ وفا میں جس کا اُجالا بکھر گیا
اب محفل حیات ہے سونی پڑی ہوئی
بزم جہاں سے کون یہ صاحب نظر گیا
اک عمر جسکے ہجر میں روئینگے یار سب
احباب کوالم میں وہ کیوں چھوڑ کر گیا
پہلے مجید و سالک و شوکت چلے گئے
وہ بھی قضا کے دوش پہ احسان دھر گیا

مدحت الاخر نے یوں لکھا۔

اُس کا جادو کا قلم رجان ہر تصویر تھا / نوک نشتر حرف / جو سخن تھا تیر تھا / دشت و
صحرا بام و در / غنچہ و گل خار / خوش زندگی کے ساتھ تھا / زندگی کا ہر نفس / لیکے پھولوں کی ہنسی /
دشت میں آیا تھا / وہ زندگی کی راہ میں / پیڑ کا سایہ تھا / وہ ہنسی چپ ہو گئی / راہ وہ سایہ کھو گیا /
موت کی آغوش میں / وہ مسافر سو گیا / جس کا جادو کا قلم / رجان ہر تصویر تھا / وہ مصور کھو گیا۔.....!

میرزا ادیب کا تعزیتی مضمون ”اوراق“ پاکستان میں شائع ہوا جس کے چند سطور راجہ صاحب کے فن پر روشنی ڈالتے ہیں۔

”اُردو کی خوبصورت ترین مزاحیہ نظموں کا خالق چل بسا ہے۔ وہ نغمہ طرب ڈوب گیا ہے جو ہونٹوں کو مسکرا نہیں اور دلوں کو خوشیاں دیتا تھا۔ وہ قہقہہ ختم ہو چکا ہے جو پاک و ہند کے فضاؤں میں گونج رہا تھا۔ اور دھوپ کی طرح ہر گھر میں پہنچ جاتا تھا۔ میں نے راجہ کو کہا تھا.... ”سنا ہے بمبئی میں مردہ زندہ ہو گیا ہے۔!“ اب میں کس سے مخاطب ہو کر کہوں.... بمبئی میں اُردو کی سچی مزاحیہ شاعری مر گئی ہے۔“

ڈاکٹر شکیل الرحمن ڈی۔ لٹ نے طویل تعزیتی مضمون لکھا جو بیسویں صدی اکتوبر ۶۶ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ جس کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

یہ آدمی بچے کی نفسیات کے مطالعہ کے لئے اہم مواد تھا.... ایک بچے کی معصومیت، ایک بچے کی ضد، ایک بچے کا بھولا پن، ایک بچے کی خوشی، ایک بچے کا غصہ، ایک بچے کی مسکراہٹ، ایک بچے کا خواب..... میں نے راجہ مہدی علی خاں میں کیا نہیں دیکھا ہے..... میں اس بچے کو بھول نہیں سکتا.... عجب نام تیرا لیجئے تب چشم بھراؤئے۔!

خوشتر گرامی ایڈیٹر بیسویں صدی سے راجہ مہدی علی خاں کی اس قدر گہری دوستی تھی کہ جس کی مثال قائم ہو گئی تھی لکھتے ہیں۔

”تقسیم وطن سے پہلے سے راجہ مہدی علی خاں فلمی دنیا سے وابستہ تھے لیکن اس کے باوجود وہ ”فلمی شاعر“ نہیں بلکہ ایک صاحب طرز طنز تھے۔ فلمی شاعری کرنا محض ان کا ذریعہ معاش تھا۔ فلمی دنیا میں بلبل ہزار داستان کی طرح وہ برسوں چپکتے رہے۔ مگر ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا.... فلمی دنیا میں برسوں چپکنے کے بعد یہ بلبل ہزار داستان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ دوسروں کو ہنسانے والا ہمیں رُلا کے جا چکا ہے۔ لیکن اس کے قہقہے ہمیشہ ایوانِ ظرافت میں گونجتے رہینگے۔“

راجہ مہدی علی خاں کو ان کی وصیت کے مطابق ماہم قبرستان میں ان کی آخری آرام گاہ بنائی گئی۔ جلوس جنازہ میں ہزاروں سوگوار شریک تھے۔ حسن اتفاق جب جنازہ لے جایا جا رہا تھا سڑک کی دونوں جانب عمارتوں سے ریڈیو سیلون سے راجہ مہدی علی خاں ہی کے گیت گونج رہے تھے۔ ”لگ جا گلے کے پھر یہ ملاقات ہونہ ہو“ ہر ایک کی آنکھیں اشکبار تھیں لاکھوں تعزیتی خطوط پیغم طاہرہ مہدی علی کو لکھے گئے۔ ہندو پاک کے اخباروں ادبی رسالوں اور جرائد میں سینکڑوں تعزیتی مضامین نشر و نظم شائع ہوئے۔ جن کا احاطہ مشکل ہے۔

عادات و اطوار کے اعتبار سے راجہ مہدی علی خاں جسقدر رزم دل واقع ہوئے تھے مزاج اتنا ہی گرم تھا۔ طبیعت کے خلاف کوئی بات برداشت نہ کرتے تھے۔ لذیذ کھانوں اور مرغ و ماہی کے شوقین تھے۔ سالن میں نمک یا مرج ذائقہ سے زائد ہو جائے تو برتنوں کی خیر نہ ہوتی۔ کانشی ناتھ (باورچی) اور طاہرہ سلطانہ کی خبر لی جاتی۔ گھر میں آئے دن دعوتیں ہوا کرتی ہیں۔ وہ کھانے اور کھلانے کے بڑے شوقین تھے۔ بقول پران (مشہور فلمی اداکار ویلن) کہ ”لوگ اکثر کھاتے ہیں جینے کیلئے لیکن راجہ صاحب جیتے ہیں کھانے کیلئے۔“ حیدر آبادی ”پائے“ طاہرہ سلطانہ خود بڑے اہتمام سے بنایا کرتیں۔ سبزی ترکاری کو گھاس پھوس کہا کرتے تھے وہ گوشت خور تھے۔ مرغن غذاؤں کی وجہ جسم بھاری ہو گیا تھا وہ پہلے ہی دوہرے جسم کے مالک تھے۔ چائے دودھ کیساتھ دن میں دو تین مرتبہ پیتے اور شکر حسب ذائقہ ڈال لیا کرتے تھے۔ جب انہیں ذیابیطیس ہو گیا تو شکر سے پرہیز کرنے لگے تھے۔ مٹھائی کے بڑے دلدادہ تھے پرہیز کے باوجود آنکھ بچا کر چٹ کر جاتے۔ طاہرہ سلطانہ ان کا بڑا خیال کرتی تھیں۔ سبھی پھل موسم کے بڑے شوق سے کھاتے لیکن انہیں غالب کی طرح آم بڑے مرغوب تھے۔ شراب سے سخت نفرت تھی۔ گھر کی نجی محفلوں میں کوئی شراب پیتا تو بڑی کراہیت محسوس کرتے۔ ایک دفعہ فلمی اداکارہ سادھنا کی شادی میں کسی نے شراب پلا دی۔ جب نشہ اترتا تو اس پر برہم ہو گئے۔ سگریٹ کے عادی نہ تھے لیکن کبھی کبھار یار دوستوں کی خاطر پی لیا کرتے۔ کچھ دن حقہ پینے کا شوق ہوا تھا پھر اُسے بھی ترک کر دیا۔ البتہ پان کے رسیا تھے۔ پان میں زردہ بہت زیادہ کھاتے۔ راجہ صاحب کے پان کھانے کا منفرد انداز تھا۔

پان منہ میں رکھا تھوڑا سا چبایا اور لطف لے کر اُگالداں میں تھوک دیتے۔ اُگالداں پان کی پیک سے بھر جاتا۔ دن میں دس بارہ مرتبہ صاف کرنے کی نوبت آتی۔ گویا ایک خادمہ صرف اُگالداں کی صفائی کے لئے مختص تھی۔ لباس ہلکا پھلکا پہنتے تھے۔ یعنی گھر میں یوں تو بنیان اور تہہ بند ہوا کرتی اور کبھی کرتے پہن لیتے اور باہر جائیں تو پینٹ بوشرٹ ٹائی کوٹ اور شوز پہنتے۔ گھر میں عام طور پر چپل ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ زندگی میں انہوں نے شيروانی یا کرائی اور لباس زیب تن نہیں کیا۔ ہلکے اور مہذب رنگ پسند تھے۔ کھیل کود وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ البتہ کبھی کبھی جاگنگ کو نکل جاتے۔ گرمی انہیں برداشت نہ ہوتی تھی۔ دن میں دو تین بار ٹھنڈے پانی سے غسل کرتے۔ صبح جب وہ غسل سے فارغ ہوتے تو ان کا ملازم ان کے پاؤں پونچھتا اور بیگم مہدی انہیں کپڑے پہناتیں بالوں میں تیل مالتی اور کنگھی کرتیں۔ اس کے بعد راجہ صاحب صبح کی نماز سے فارغ ہو کر اپنی مخصوص کرسی ”راکنگ چیر“ پر براجمان ہو جاتے۔ اس دوران ملاقاتی آتے تو ان سے ملاقات کرتے۔ اس تعلق سے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں۔

”عام طور سے اپنی جھولا نما کرسی چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔

خود مہمان ان کی راکنگ چیر کے رکنے یا تیز تیز چلنے ہی سے راجہ صاحب کے موڈ کے بارے میں اندازہ کر لیتے ہیں۔ مثلاً اگر مہمان کی آمد پر کرسی میں زلزلہ آجائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مہمان سامنے بچھے ہوئے صوفے کے

آخری کونے میں بخوشی بیٹھ سکتا ہے۔ اور اگر کرسی دفعتاً رک جائے اور راجہ صاحب کی زبان کالشی ناتھ کو اس کے سلسلہ نسب کے بعض نازک مقامات سے آگاہ کرنے لگے تو مہمان فوراً جان لیتا ہے کہ صورت حال خطرناک ہے۔“ ۱

ملاقاتیوں میں اگر کوئی حاجت مند ہو تو راجہ صاحب حتیٰ المقدور امداد کرتے۔ کوئی سفارش کے لئے آتا تو سفارشی خطوط لکھ دیتے۔ بیروزگار ہو تو کام دلوا دیتے۔ جب تک کسی کو کام نہ ملے وہ راجہ کی جیب سے وظیفہ پاتا۔ غریبوں، بیواؤں، یتیموں کی امداد میں روحانی تسکین محسوس کرتے۔

بقول خوشتر گرامی

”بیگم سے کہتے یہ غریب آدمی جو آیا ہے اسے پچاس روپے دے دو۔ اس بیچارے کو اپنی بیٹی کا کنیا دان کرنا ہے اسے فوراً دو سو روپے دے دو۔ اسے قلم میں کوئی کام نہیں ملا۔ فی الحال اسے سو روپے دے دو..... طاہرہ! یہ عورت بہت تنگدست ہے اسے کچھ دے دو۔ پھر ڈاک کی چھان بین ہوتی۔ ڈاک سے آئے ہوئے تمام خطوط خود بہ نفس نفیس کھول کر پڑھتے اور خود ہی جواب لکھتے۔“ ۲

راجہ مہدی علی خاں ایک مخلص اور دردمندوں کے مالک تھے۔ خطوط کے جواب لکھنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ خطوط ہی کے ذریعہ کئی دوست بن گئے تھے۔ ادبی دنیا اور فلمی دنیا میں ان کے لاکھوں پرستار تھے۔ مخلص دوستوں پر جانثار کرتے۔ ریاکار دوستوں کو تاڑ لیتے اور وہ ان لوگوں سے نفرت کرتے تھے۔ ان سے ملنا تک گوارا نہ کرتے۔ خوش اخلاق ملنسار اور قہقہہ باز آدمی تھے۔ ان کی باتیں لطیفوں کی طرح ہوا کرتیں۔ بات میں بات پیدا کر کے محفل کو لالہ زار بنادیتے جو کوئی ایک بار ان سے ملے بار بار ملنا چاہتا اور ان کی ایک ملاقات یادگار ملاقات بن جاتی۔ حافظہ بلا کا پایا تھا۔ دوستی میں بیہودہ مذاق اور بے حیائی پر برہم ہو جاتے۔ ادبی مذاق پر خود بھی قہقہہ لگا دیتے۔ بظاہر تو وہ جاہ و جلال کے آدمی تھے لیکن ان کا دل نہایت نرم اور محبت سے لبریز تھا۔ بڑی بے تکلفی سے ملتے جیسے بہت پرانی ملاقات ہو۔ ان کی تحریروں میں بالخصوص خطوط میں وہی بے تکلفی اور بے باکی ہے۔ رعب دار چہرہ اور بھاری بھر کم آواز سے لوگ گھبرا جاتے تھے۔ جو بھی گھر آتا بڑی تو انہیں ہوتی۔ ضیانتوں کے رسیا تھے۔ کبھی کوئی ان کے گھر سے بھوکا نہیں لوٹا۔ جوتشوں کی بڑی قدر کیا کرتے۔ آخری دنوں علم نجوم پر بڑا عقیدہ ہو گیا تھا۔ بخاری صاحب کی جو Astrologist تھے بڑی عزت کرتے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ راجہ صاحب کا ستارہ عقرب ہے۔ اور آٹھ نمبران کے لئے نہایت فائدہ مند ہے۔ وہ ہزاروں روپے نجومیوں پر خرچ کر ڈالتے تھے اور اکثر دھوکے بھی کھا جاتے۔ علم نجوم کی ڈیروں کتابیں انہوں نے جمع کر رکھی تھیں۔ اور ان کا مطالعہ بڑے انہماک سے کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر شکیل الرحمن نے اپنے مضمون میں بھی ایک واقعہ لکھا ہے جس سے راجہ صاحب کے اس عقیدہ اور ان کی چلبلی طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

”میں صرف دو برس اور زندہ رہوں گا!“ راجہ مہدی علی خاں نے پانی کا گلاس ختم کرتے ہوئے کہا..... کس اُلو کے پٹھے نے کہہ دیا آپ سے! میں نے جھنجھلا کر کہا۔

”ایک نجومی نے..... انہوں نے اپنے خاص انداز سے کہا۔ بہت بڑا نجومی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے میرے بارے میں سب کچھ کہہ دیا..... آپ ملیں گے تو چہرہ دیکھتے ہی کہہ دیگا کہ شکیل الرحمن کی کتنی محبوبائیں ہیں اور اس مکار نے کتنی لڑکیوں سے عشق کیا ہے..... میں پان چباتے ہوئے ان کے قریب چوکی پر بیٹھ گیا اور سامنے پڑی ہوئی ایک کتاب الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ وہ پامسٹری کی کتاب تھی۔

”راجہ صاحب! پامسٹری کی ان کتابوں کو الماری میں بند کر دیجئے نجومیوں سے ملنا چھوڑ دیجئے۔ خدا کی قسم عمر بڑھ جائیگی۔ میں نے مشورہ دیا۔“

پامسٹری کی ڈھیر ساری کتابیں جمع کر رکھی تھیں آخر عمر میں راجہ صاحب کو کچھ ایسا

عقیدہ ہو گیا تھا کہ جو بھی ان سے ملنے آتا راجہ صاحب اُس کے ساتھ یہی گفتگو کرتے۔ ان دنوں کوئی نہ کوئی نجومی آ جاتا۔ اور راجہ صاحب اندھی عقیدت میں دھوکا کھا جاتے۔ طاہرہ سلطانہ (بیگم راجہ مہدی علی خاں) نیک نفس اور فرمانبرداری میں سب کچھ سہہ جاتیں۔ ایک دفعہ ایک ”بابا“ گھر آ گئے اور کچھ ایسے راجہ صاحب کو اپنا گرویدہ بنا لیا کہ راجہ صاحب اس کی بڑی تواضع اور کئی دنوں اپنے ہاں مہمان رکھا۔ ان دنوں طاہرہ سلطانہ کو بڑی زحمتیں اٹھانی پڑی۔ دن میں کئی بار چائے وغیرہ کا انتظام کرنا بابا کی فرمائیشی کھانے تیار کرنا۔ وغیرہ کافی دنوں بعد وہ رخصت ہوا تو راجہ صاحب نے اسے تحفے تحائف اور نقدی دے کر رخصت کیا۔ کچھ دنوں بعد ایک عورت بابا کو تلاش کرتی ہوئی راجہ صاحب کے گھر پہنچی اور کہا ”وہ“ کہاں ہے؟ راجہ صاحب کے دریافت کرنے پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ عورت بابا کی بیوی ہے جبکہ بابا نے انہیں ”مجرد“ بتایا تھا۔ جب دوسری مرتبہ وہ آیا تو راجہ صاحب نے اسے دھکے دے کر باہر کر دیا۔ اس طرح راجہ صاحب کئی دفعہ ان ڈھونگیوں سے دھوکا کھاتے رہے تاہم ان کے اس عقیدے میں کوئی فرق نہ آیا۔

رام لعل اپنے ایک مضمون میں جو انہوں نے راجہ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بارے میں لکھا تھا اس میں رقم طراز ہیں۔

”وہ کیریوز کی نیو مرولوجی میں بھی اعتقاد رکھتے تھے۔

انہوں نے اپنے اور میرے ناموں کے اعداد و شمار نکال کر

میرے ساتھ ہاتھ ملا کر کہا۔ ”میری اور تمہاری دوستی کبھی

ہے۔ کبھی نہیں ٹوٹے گی۔“ میں نے انہیں ان کی غلطی کا احساس دلایا کہ انہوں نے میرا نمبر غلط نکالا ہے تو کتاب کے مطالعہ میں پھر کھو گئے اور پھر بڑی مایوسی کا اظہار کیا۔ میں نے ان کی بات غلط ثابت کر دی تھی۔ لیکن انہوں نے اور کتنے دوستوں اور عزیزوں سے جن کے ساتھ اپنے رشتے کو مستحکم تر سمجھتے تھے۔ ۲۷ جولائی کو اچانک انتقال فرما کر اپنی اور دوسروں کی خوش فہمی دور کر دی ان کی باتوں میں یقین نہ رکھ کر میں نے خود کو کتنے بڑے صدمے سے بچا لیا ہے۔ ایک مخلص دوست کی موت کا صدمہ برداشت کر کے میں نے ایک وہم سے بھی نجات پالی ہے یہ دونوں موتیں کتنی متضاد قسم کی ہیں۔“ جگدیش بھل نے کہا۔

”راجہ مہدی علی خاں نہایت شگفتہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ جب کبھی ہم اپنی طبیعت میں بوجھل پن محسوس کرتے ان کے ہاں چلے جاتے۔ ان کی شگفتہ باتوں سے طبیعت ہلکی ہو جاتی۔ ساری اُلجھنیں پریشانیاں دور ہو جاتیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کہتے۔ ”آج کیسے آنا ہوا....!“ میں کہتا۔ بندے کو پیسے سے زیادہ اور کیا ضرورت ہوگی....!“ ”پرسوں ہی تو

دس کروڑ دیے تھے۔ اتنا جلدی ختم ہو گئے؟“ اس بار پندرہ کروڑ رکھ لو..... پھر آئندہ پھوٹی کوڑی نہ ملے گی....!“ اور ہم ان کی ان پر لطف باتوں سے محفوظ ہوتے۔ وہ کبھی خود کے بھاری بھر کم جسم اور ڈیل ڈول پر بھی لطیفے جڑ دیا کرتے۔ ہم ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ وہ میری بیگم (عالیہ) سے ”حیدر آبادی بیگن“ کھلانے کی فرمائش کرتے۔ جب کبھی گھاس پوس کھانے کی خواہش ہوتی وہ ہمارے گھر چلے آتے۔ دل کے وہ راجہ تھے بے سہاروں کے سہارا، غمزدہ اور پریشان حال لوگوں کیلئے مسیحا تھے۔“

راجہ مہدی علی خاں طبعاً عاشق مزاج تھے۔ لیکن چھپورا پن قطعی برداشت نہیں کرتے تھے۔ کسی پر غصہ آ جاتا تو سخت برہم ہو جاتے لیکن فوری معمول پر آ جاتے تھے ان کا غصہ وقتی ہوا کرتا تھا۔ اور پھر وہی ہنسنے ہنسانے کی باتیں ہوتیں۔ انہیں غم تھا تو فقط اپنی بگڑتی صحت کا۔ اولاد سے محرومی کا اور اپنی ماں کا..... لیکن اس کا احساس کبھی اپنے چہرے سے تک ظاہر نہیں کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں۔

”حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ شخص جسکی زندگی ایک مسلسل کرب کی تصویر تھی جب شعر کہنے لگتا تھا تو اس کے قلم سے خون کی بجائے امرت چھلکتا تھا۔ آنسوؤں کی بجائے تبسم

ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا تھا۔ اور ایک عالم اس کی بیٹھی کوئل
باتوں میں اپنے دکھوں کا مداوا تلاش کرتا تھا۔ مسعود شاہد
مرحوم نے کسی زمانے میں سرکس کے ایک مسخرے فناؤ
کے بارے میں ایک افسانہ لکھا تھا کہ کس طرح فناؤ کا دل
رورہا ہوتا تھا اور زبان محفل کو زعفران زار میں تبدیل کرتی
جاتی تھی۔ میں سوچتا ہوں کہ راجہ مہدی علی خاں بھی تو اردو
ادب کا فناؤ تھا کہ ہر چند اس کی اپنی ذات دکھوں،
محرومیوں اور نارسا آرزوؤں کی آماجگاہ تھی۔ لیکن اس کی
زبان اور قلم خوشیوں اور قہقہوں کی تقسیم پر مامور تھے۔“ ۲

کبھی گھر کی نوک جھونک گیت یا نظم میں ڈھل جاتی تو روزمرہ زندگی کے چھوٹے
موٹے واقعات مواد فراہم کر دیا کرتے۔ ایک دفعہ بیگم ان کے غصہ کی وجہ روٹھ گئیں پھر تھوڑی
دیر بعد انہیں مسکراتے دیکھا اور بس راجہ کی زبان پر بے ساختہ مصرعہ آگیا۔ ”آپ کی نظروں
نے سمجھا پیار کے قابل مجھے“ پھر کیا تھا یہ فلمی گیت بن گیا۔ اکثر وہ بسوں، ٹرین یا کبھی کبھی چلتے
پھرتے، بیٹھے بیٹھے ہی شعر کہہ دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا ایک پرسنل سکرٹری بھی رکھا
تھا۔ جس کا تخلص انہوں نے وفارکھا تھا۔ اس لئے کہ اس پر انہیں کوئی اعتبار نہ تھا۔ خطوط کے
جوابات ہو یا گیت کی نقل یا پھر نظموں کو پریس بھیجنا ہوتا تو خود ہی اپنی نگرانی میں انجام دیتے۔
سکرٹری برائے نام تھا بے کار لوگوں کو کوئی نہ کوئی کام سے لگا دیتے تھے۔ راجہ مہدی علی خاں

کے دوستوں کی بڑی لمبی فہرست ہے۔ جن میں قابل ذکر سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی،
شاہد احمد دہلوی، خوشتر گرامی، شکیل بدایونی، قتیل شفائی، ڈاکٹر وزیر آغا، انور سدید، کرشن چندر،
خواجہ احمد عباس، اختر مرزا، محمد طفیل احمد، کلیم یوسف حسین، کرنل سلیم، میجر سلیم، جگدیش بھل،
اعظم راہتی، اوپندر ناتھ اشک، انصاری، اختر الایمان، سلیمان اریب، جاثرا اختر، مجروح
سلطانپوری، رام لعل، سمت پرکاش شوق وغیرہم۔ ہندوستان، پاکستان اور دیگر ممالک میں
راجہ صاحب کے چاہنے والوں کی کثیر تعداد تھی جن سے وہ خط و کتابت کیا کرتے تھے۔ نئے
نئے دوست بنانا اور ان سے والہانہ محبت کرنا۔ اپنوں اور اجنبیوں سے بے تکلف ہو جانا راجہ
صاحب کی طبیعت کا خاص وصف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک بار ملنے والا شخص انہیں ہمیشہ یاد رکھتا
تھا۔ اور آج بھی جبکہ ان کے گزرے ہوئے چالیس سال سے زائد عرصہ بیت گیا۔ پھر بھی ان
کی یادوں کی شمع روشن ہے۔ فلمی دنیا میں بھی ان کے عقیدتمندوں کی کافی تعداد ہے بڑے
احترام سے ان کا نام لیا جاتا ہے۔ پریم جی پروڈیوسر نے بتایا۔

”آج ہمارے درمیان وہ مہان آتما نہ رہی۔ ایسے لوگ

بہت کم جنم لیتے ہیں۔“ ۱

راجہ مہدی علی خاں زندہ دلی کیساتھ ساتھ روشن خیال اور آزاد منش آدمی تھے۔
انہوں نے ہمیشہ مذہبی وسیع نظری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کا دل تعصب و عناد سے پاک تھا۔ وہ
ہندو مسلم، ذات پات کا کوئی بھید بھاؤ نہیں رکھتے تھے بلکہ بلا تکلف کچھ ایسے جملے کہہ جاتے کہ
لوگ ان جملوں میں ظرافت کی وجہ کوئی اثر لئے بغیر لطف اندوز ہوتے۔ مثلاً نریش کمار شاد کو

دیئے گئے انٹرویو کے چند جملے ملاحظہ ہو۔

”تو نئی دلی سے بمبئی میں میرا انٹرویو لینے چلا آیا۔ کیا تو بہت بڑا بے شرم ہے؟ اگر ہے تو تو کیوں ہے میں کیوں نہیں؟ بھلے آدمی یہ تو سوچ کہ میرا انٹرویو لینے سے قوم، میرا مطلب ہے شاعروں کی قوم پر تیرا کیا امپریشن پڑیگا؟ مزاح نگاروں کی دل آزاری ہوگی۔ اے ناعاقبت اندیش کمار! اگر تو مسلمان ہو گیا تو کبھی نہیں بخشا جائیگا۔“ ۲

کبھی انہوں نے اپنے ہندو دوستوں کو ہندو اور مسلمان دوستوں کو مسلمان نہیں جانا بلکہ انسان کو انسان اور انسانیت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ ان کی نظر بڑی پاک و صاف تھی جتنا کہ ان کا دل۔ وہ اپنے خطوط میں بھی بڑی بے باکی کیساتھ اس قسم کے جملے استعمال کرتے تھے۔ رام لعل کو لکھتے ہیں۔

”نوسو برس کے بڑھے کھوسٹ مسلمان..... مسٹر اللہ رکھا عرف رام لعل! سلام علیکم! شرم نہیں آتی کہ نو جوان ہندو پر خواہ مخواہ رعب ڈالتے ہو۔ تم لوگوں کی ذات ہی کچھ ایسی ہے۔ جھوٹے رعب داب کے سوار کھا ہی کیا ہے۔ ایک تو

میرے دو سو خطوط کا جواب نہیں دیا.....“ ۱

رام لعل کے خط میں کس قدر بے تکلفی اور بے باکی ہے ایک اور خط ملاحظہ ہو۔

”میں نے خط میں Pure گھی کا دھبہ لگا کر بھیجا تھا جسے تم مٹی کا تیل یا پٹرول کہہ رہے ہو۔ ہندوستان میں تم لوگوں نے اقلیتوں کی یہی حالت بنا رکھی ہے۔ ان بچاروں کا خالص گھی بھی تم لوگوں کو پٹرول معلوم ہوتا ہے۔ افسوس! مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال جی کی نصیحتیں اور لکچر تم لوگ کتنی جلدی بھول گئے۔“ ۲

راجہ مہدی علی خاں کا عقیدہ تھا کہ انسان کی عظمت اس کی انسانیت سے ہے نہ کہ اس کی رنگ و نسل سے مذہب یا دھرم کا تعلق اس کی روح سے ہوتا ہے جسم سے نہیں۔ وہ رواداری اور بھائی چارگی کے حامی تھے۔ جسم کا وجود روح کی موجودگی سے ہے اور جب روح نکل جائے تو جسم کی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس خیال کو راجہ صاحب نے رام لعل کے خط میں کچھ اس طرح لکھا ہے۔

”تسلیم کے بعد عرض ہے کہ میں مر گیا تھا۔ ایک ٹانگ مسلمانوں نے قبر میں دفن کر دی، ایک ٹانگ ہندوؤں نے جلادی۔ سر سکھ لے گئے۔ ایک بازو مہاتما بدھ کے پجاری لے گئے۔ باقی حصہ کتے کھا گئے..... یہ ہوا میرا انجام....

فقط..... مرحوم“ ۱

اس طرح وہ اپنی ظرافت سے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں میں ہر د عزیز تھے اور

خود بھی اپنے ناموں کے ساتھ ہندو نام جڑ لیا کرتے مثلاً راجہ مہدی علی خاں بھائیہ، پنڈت راجہ مہدی علی خاں، راجہ رام علی خاں، راجہ ہندو علی خاں وغیرہ۔ راجہ مہدی علی خاں ”سیاست“ سے دور رہا کرتے تھے۔ ان کا تعلق نہ تو کسی سیاسی گروہ سے تھا نہ کسی تحریک سے وہ وابستہ رہے۔ نریش کمار شاد نے ان سے ان کی سیاسی نظریات سے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ

”بڑا خطرناک آدمی ہے تو میرے یار! جو مجھ سے ایسا خوفناک سوال پوچھ رہا ہے کہ میرے سیاسی نظریات کیا ہیں؟ کیا تو مجھے قید کرا کے میری جائیداد پر خود قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اور پھر میں اگر یہ کہوں کہ کمونسٹ ہوں تو کانگریسی حضرات تھو تھو کریں گے۔ اور بھئی کی پبلک مجھے پیٹ ڈالے گی۔ اور اگر کہوں کہ کانگریسی ہوں تو خواجہ احمد عباس، سجاد ظہیر، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور راجگو پال اچار یہ میرا حقہ پانی بند کر دیں گے۔ رہا سوشلزم تو وہ مجھے معلوم نہیں کیا ہوتا ہے۔ ایک موچی سے پوچھا تو اس نے بتائے سے انکار کر دیا۔“

حالانکہ یہ وہ دور تھا کہ آدمی کے سیاسی نظریات بدل رہے تھے۔ اور سیاسی حالات سے ادیب و شاعر بھی متاثر ہو رہے تھے۔ شاعری بھی متاثر تھی۔ لوگوں میں انقلابی جوش تھا۔

اور پھر ملک کی تقسیم کے بعد ہندو مسلم نظریات میں بہت بڑا فرق آ گیا تھا۔ ہندو مسلم کے متفرق جذبات بھڑکنے لگے ملک فسادات کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ ہر طرف عزت و ناموس کے لالے پڑ گئے تھے۔ حالانکہ فلم انڈسٹری شروع ہی سے ہندو مسلم کے بھید بھاؤ سے پاک تھی۔ ان کے ہاں ذات پات کی کوئی دیوار نہ تھی یہاں صرف فن اور فنکار ہی کی پہچان تھی۔ ان حالات میں فلم انڈسٹری مالی مشکلات کا شکار ہو گئی جسکی وجہ فلمی دنیا سے جڑا ہوا ہر شخص معاشی پریشانیوں کا شکار تھا۔ ۱۹۵۷ء میں راجہ صاحب بھی معاشی اعتبار سے پریشان ہو گئے تھے۔ وہ ان حالات سے بھی دل برداشتہ ہو گئے تھے یہاں تک کہ واپس پاکستان جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ جب مدن موہن جی (میوزک ڈائریکٹر) جو راجہ صاحب کے گہرے دوست تھے انہیں پتہ چلا کہ راجہ پاکستان لوٹنا چاہتے ہیں تو وہ فوراً ان کے گھر پہنچے اور انہیں روک لیا۔ پھر سے گیت لکھنے کا حوصلہ دیا۔ فلم ”دو بھائی“ کے گیت لکھوائے اور یہی گیت ان کی شہرت کا پہلا زینہ ثابت ہوئے۔ مدن موہن جی اور راجہ مہدی علی خاں کی دوستی ان کے آخر دم تک برقرار رہی۔

راجہ صاحب کا مزاج قلندرانہ تھا۔ گھریلو حالات بھی کچھ ایسے نہ تھے کہ راجہ صاحب کو روزگار کے لئے در بدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور کرتے۔ والد کی زمینداری تھی لیکن راجہ صاحب سیر سپاٹے کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایف۔ اے (انٹرمیڈیٹ) کے بعد صحافت سے وابستگی اختیار کی۔ اپنے آبائی گاؤں سے لاہور آنے کا تذکرہ ”مثنوی تاج دین معراج دین“ میں یوں کیا ہے۔

میں لکھنے سے پہلے یہ کرتا ہوں طے

یہ انیس سو تیس کا ذکر ہے

یہاں سے میں پہنچا ہوں لاہور میں

سمجھ لیجئے انگریز کے دور میں

میں ہوں اور پنجاب کے زندہ دل

وہ رخشندہ چہرے وہ تابندہ دل

میں گھر سے نکل آیا بازار میں

سمجھ لیجئے کوٹ اور شلوار میں

(”انداز بیاں اور“)

ریڈیو اسٹیشن کی کشش نے انہیں دہلی کی طرف کھینچا۔ یہاں سے ان کے ذوق سلیم نے انہیں فلمی دنیا تک پہنچا دیا اور تقسیم ملک کے بعد وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ راجہ صاحب گھر سے بزرگوں کی اجازت کے بغیر نکل پڑے تھے اسی وجہ سے ان کے والدین بھائی بہن وغیرہ ان سے ناراض تھے حالانکہ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ راجہ صاحب چونکہ ہندوستان میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی اور یہیں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ ان کا پاکستان آنا جانا بھی نہ رہا اور ملک کے حالات بھی کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ پاکستان آنا جانا اتنا آسان نہ تھا۔ شادی کے بعد وہ اپنی بیگم طاہرہ سلطانہ کیساتھ صرف ایک مرتبہ اپنے وطن گئے تھے۔ پھر اس کے بعد صرف خط و کتابت ہی کا سلسلہ رہا۔ راجہ صاحب کے انتقال

کے بعد یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

راجہ مہدی علی خاں کا ذریعہ معاش ان کی فلمی شاعری تھی۔ وہ فلمی گیتوں کا معاوضہ بہت کم لیتے تھے اور اس معاملے میں وہ سخت تھے لیکن کسی کو بخشے نہ تھے۔ پروڈیوسروں کی بے رحمی اور سنگدلی، فنکاروں کے معاوضوں کی ادائیگی میں لا پرواہی اور اس کے ساتھ ساتھ ایک فنکار کی مجبوریوں کا احساس بھی سامنے آتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ راجہ صاحب باوجود اپنی مجبوریوں کے اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ خود ان کی طبیعت کی سادگی فطری اور خاندانی تھی۔ اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے تھے۔ کبھی ان کی پیشانی پر بل نہ پڑا اور نہ کبھی ان کے چہرے پر الجھنوں کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ ہمیشہ خوش و خرم رہا کرتے تھے۔ ہنسا ہنسانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ اپنی بیماری کے دنوں میں بھی ظرافت سے باز نہ آتے تھے۔ نرسنگ ہوم کے ملازم نرس، ڈاکٹرس وغیرہ سے بلا تکلف مذاق کیا کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ لوگ ان سے گھل مل جاتے تھے۔ رام لعل اپنی رپورتاژ میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ

”ایک کن جسیڈ چار منزلہ اسپتال، دوسرے فلور پر ایک

نرس نے رہنمائی کی۔ میں.... دستک دے کر سامنے جا کر

کھڑا ہو گیا ہوں۔ دروازہ تو پہلے سے ہی کھلا ہے۔ ایک

پلنگ پر چند خواتین بیٹھی ہنس رہی ہیں۔ دائیں طرف

دوسرے پلنگ پر دو میل نرس ایک بے حد ٹکڑے آدمی کے

بدن کی مالش کرنے میں جٹے ہیں۔ میں راجہ صاحب کو دیکھتے ہی پہچان گیا ہوں۔ میرے ہاتھ میں چمڑے کا بیاگ دیکھ کر ایک خاتون (بیگم راجہ مہدی علی خاں) جلدی سے راجہ صاحب کی طرف لپکتی ہے۔ ”اٹھئے اٹھئے!“ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں.....!“ میں کہنا چاہتا ہوں لیکن راجہ صاحب نے زور سے آنکھیں میچ لی ہیں....“ میں سو رہا ہوں۔ ڈاکٹر سے کہہ دو.....!“

”دیکھئے تو..... ڈاکٹر صاحب کھڑے ہیں....!“ وہ قدرے غصہ سے کہہ جاتی ہیں۔ لیکن راجہ صاحب جواب نہیں دیتے۔ آنکھیں نہیں کھولتے۔ زور زور سے خراٹے لینے لگتے ہیں۔ میں دھیرے سے معذرت خواہ لہجے میں ان کی بیگم کو بتاتا ہوں۔ میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ میں لکھنؤ سے آیا ہوں۔ میرا نام ”ادہ... ادہ...“ ادہ! اب سب خواتین مجھ سم تاسف بن رہی ہیں۔ اور راجہ صاحب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے دونوں بازو پھیلا کر ایک عجیب سے ڈھنگ سے روتے ہوئے (جو اس وقت مجھے بڑا مصنوعی لگا تھا) کہہ رہے ہیں ”میرا

دوست آیا ہے لکھنؤ سے مجھ سے ملنے..... مجھے اٹھاؤ....“ ارے کم بختو! مجھے اٹھا کر بٹھاؤ کہ اپنے دوست سے گلے مل سکوں۔“

اس اقتباس سے واضح ہے کہ راجہ صاحب بستر مرگ پر بھی اپنی زندہ ولی اور شگفتہ مزاجی سے افسردہ ماحول کو بھی خوشگوار ماحول بنا دیا کرتے تھے۔ سیدنا نظر حسین عزیز نے بھی ایک واقعہ نقل کیا ہے لکھتے ہیں۔

”راجہ مہدی علی خاں ماہم ہسپتال بمبئی میں زیر علاج تھے۔ ان دنوں کنہیا لال کپور ان کی مزاج پر سی کو وہاں پہنچے۔ راجہ مہدی علی خاں جو اپنی شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی کے لئے مشہور تھے انہیں دیکھتے ہی اپنے مخصوص انداز میں یہ شعر پڑھا۔

دو گھڑی آ کے ذرا بیٹھئے بیمار کے پاس
کیوں کبھی آتے نہیں عاشق مکار کے پاس
یہ سنتے ہی کنہیا لال کپور جو کھڑے ہوئے تھے ہنستے ہوئے بیٹھ گئے۔“

راجہ مہدی علی خاں جب کوئی عیادت کے لئے افسردہ چہرہ لے کر آتا اُسے مسکراتے پر ہنسد کر دیتے اور وہ مسکراتا۔ راجہ صاحب کو غمزدہ چہرے پسند نہ تھے۔ وہ ہر ایک چہرے سے

غم کی پرچھائیاں تک نوج ڈالنا چاہتے تھے۔ وہ ایک ایسے عظیم کام کیلئے پیدا کئے گئے تھے جو دوسروں کو ہنسانا تھا اور وہ مرتے دم تک اپنا یہ مشن جاری رکھے ہوئے تھے۔

راجہ مہدی علی خاں نے اپنی زندگی میں کسی بھی تحریک سے خود کو وابستہ نہ رکھا خواہ وہ سیاسی ہو یا ادبی جبکہ ان کے ہم عصر شعرا سیاسی اور ادبی تحریکوں سے وابستہ تھے۔ خواجہ احمد عباس، سجاد ظہیر، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاٹا اختر وغیرہ کمیونزم کے قائل تھے۔ ادبی تحریکوں میں دو بڑی تحریکیں زور و شور سے چل رہی تھیں۔ اور ان تحریکوں کے کسی بھی گروہ سے وابستگی شہرت کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ یعنی ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق راجہ صاحب کا ان دونوں تحریکوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان کی اپنی الگ دنیا تھی اور اسی دنیا کے خود راجہ تھے۔ جس میں قہقہوں کے شگوفے ہمیشہ کھلتے رہتے تھے۔ جہاں چاند ہر وقت مسکراتا تھا اور ستارے ان کی کھلنڈ رانہ حرکتوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

☆☆☆



راجا مہدی علی خاں



راجہ مہدی علی خان

دوسری عالمی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ بھائی جان ممتاز ملک کو بھی مولانا چراغ حسن حسرت اور فیض احمد فیض کے ساتھ فوج کے محکمہ انفارمیشن میں اعزازی کمیشن مل چکا تھا۔ اولڈ سیکرٹریٹ سے ایک ”فوجی اخبار“ نکلتا تھا۔ حسرت صاحب اور کیپٹن ملک اسی اخبار میں کام کرتے تھے۔

میں تانگے سے اتر کر تیس ہزاری والے اپنے کوارٹر میں پہنچا تو بڑی بہن سمجھ گئی کہ میں ایک بار پھر گھر سے فرار ہو کر نکلا ہوں۔ اس نے تھوڑی بہت ناراضگی کا اظہار کیا۔ زیادہ ڈانٹ ڈپٹ نہ کی۔ کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے سے میں وہاں سے بھی بھاگ جاؤں گا۔ تیس ہزاری کے یہ کوارٹر این ٹائپ تھے اور ایک قطار کی شکل میں چلے گئے تھے۔ ہر کوارٹر کے آگے چھوٹا سا برآمدہ اور پیچھے ایک صحن تھا۔ ان کوارٹروں کی حیثیت ادبی اعتبار سے بڑی تاریخی بن گئی تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں ان کوارٹروں میں برصغیر کے چوٹی کے ادیب اور شاعر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ والے کوارٹر میں اردو کے نامور افسانہ نگار کرشن چندر رہتے تھے۔ اس سے آگے افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک کا کوارٹر تھا۔ اگلے کوارٹر میں عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو رہائش پذیر تھے۔ اس سے آگے منفرد شاعر ن۔ م۔ راشد کا کوارٹر تھا۔ اس زمانے میں یہ سب لوگ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے۔

جب میں وہاں پہنچا تو یہ خبر گرم تھی کہ مشہور طنز نگار شاعر راجہ مہدی علی خان

بھی آرہے ہیں اور وہ ہمارے کوارٹر کے ایک کمرے میں سکونت اختیار کریں گے۔ ان سب ادیب شاعروں کی شکلوں سے میں واقف تھا۔ امرتسر کی میونسپل لائبریری میں بیٹھ کر ادب لطیف اور جہازی سائز کے رسالے ادبی دنیا میں ان کی تخلیقات کا باقاعدہ مطالعہ کیا کرتا تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ان سب شاعر ادیبوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ یہ ایک بڑا بے مثال حسن اتفاق تھا کہ اردو کے اتنے بڑے بڑے ادیب ایک جگہ اکٹھے رہ رہے تھے۔ یہ ایک تاریخی بات تھی۔ اوپندر ناتھ اشک جس کوارٹر میں رہتا تھا وہ ہمارے کوارٹر سے آگے تیسرا کوارٹر تھا۔ شام کو اس کے بلند قہقہوں کی آواز اکثر سنائی دیتی۔ اس نے دلی میں آکر کوشیلا نامی لڑکی سے دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ چھوٹے قد کی بڑی گھریلو خاتون تھی۔ کوشیلا کسی دفتر میں ملازمت کرتی تھی اور اوپندر اشک اسے روزانہ صبح سائیکل پر چھوڑنے جاتا تھا۔ کوشیلا سے اشک کی شادی کی داستان کو افسانے کی شکل میں اشک نے اپنے افسانے ”کوارٹر نمبر سات“ میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔

ہمارے کوارٹر کے سامنے بھیروں جی کا ایک چھوٹا سا پرانا مندر تھا۔ یہاں صبح شام ہندو عورتیں آرتی پوجا کو آتیں اور گھنٹیوں کی آواز میں سنائی دیا کرتی تھیں۔ ان کوارٹروں کے بارے میں کرشن چندر نے بھی ایک افسانہ لکھا تھا جس کا نام ”بھیروں جی کا مندر“ ہے۔ اس افسانے میں کرشن چندر نے اتنے سارے ادیبوں کے ایک جگہ اکٹھے مل بیٹھنے کی روئیداد لکھی ہے۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ کرشن چندر ہمارے ساتھ والے کوارٹر میں رہتا تھا مگر میں اسے وہاں ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھ سکا۔ صرف ایک بار آل انڈیا ریڈیو میں ن م راشد صاحب کے کمرے میں اسے دیکھا۔

اوپندر ناتھ اشک بڑا کنجوس تھا۔ اس کی کنجوسی کے اس کے دوستوں میں بڑے چرچے ہوتے۔ منٹو اور راجہ مہدی علی خان اسے آڑے ہاتھوں لیتے تھے۔ مجھے خواب کی طرح یہ منظر یاد ہے۔ اوپندر ناتھ اشک نے اپنے کوارٹر میں چائے پر سب ادیبوں کو بلایا تھا۔ میں بھی بھائی جان کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ راشد صاحب، منٹو، راجہ مہدی

علی خان اور کرشن چندر اور ایک دوسرے صاحب ہوا کرتے تھے وہ بھی وہاں موجود تھے۔ کمرے کی دیوار پر زنانہ ریشمی سوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ منٹو نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”اشک بڑا کمینہ ہے۔ یہ ریشمی سوٹ یہاں اس لئے لٹکا رکھے ہیں اس نے کہ ہم پر رعب پڑے کہ اس کی بیوی کے پاس اعلیٰ قیمتی سوٹ ہیں۔“

راجہ مہدی علی خان نے اس محفل میں اشک کی کنجوسی کا ایک فرضی واقعہ گھڑ کر سنایا تھا۔ اس کے سوا مجھے اس یادگار محفل کی اور کوئی بات یاد نہیں رہی۔

جس روز راجہ مہدی علی خان ہمارے کوارٹر میں رہنے کے لئے آئے میں گھر پر نہیں تھا۔ دلی شہر کی آوارہ گردی کو نکلا ہوا تھا۔ شام کو واپس آیا تو بھائی جان کے پاس برآمدے میں ایک گول مٹول موٹی گردن والا آدمی بیٹھا تھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے کوئی پہلوان لگا۔ بھائی جان نے میرا تعارف کروایا اور معلوم ہوا کہ یہ راجہ مہدی علی خان ہے۔ راجہ صاحب آل انڈیا ریڈیو دلی میں ملازم ہو کر آئے تھے۔ دلی آتے ہی انہوں نے ایک نئی سائیکل خریدی۔ یہ سائیکل ہمارے کوارٹر کے ایک کمرے میں پڑی ہوئی تھی۔ شام کو میں سائیکل نکال کر تیس ہزاری کے علاقے کی سڑکوں پر مڑ گشت کو نکل جاتا۔ راجہ مہدی علی خان میرے ساتھ بڑی شفقت کا سلوک کرتے۔ اس زمانے میں میرا جسم بھاری تھا۔ وہ بھی مجھے پہلوان کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ ایک روز مجھے بڑی رازداری سے کہنے لگے۔

”ریڈیو سٹیشن کے پاس جو میڈن ہوٹل ہے اس کے باہر فٹ پاتھ پر ایک انگریز عورت پان بیچتی ہے۔“

میں علی پور روڈ سے کئی بار گذرا تھا مگر مجھے وہاں کبھی کوئی ایسی عورت نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے تعجب کا اظہار کیا تو راجہ مہدی علی خان نے فوراً کہا۔

سائیکل پر بیٹھو۔ میں ابھی چل کر تمہیں دکھاتا ہوں۔ میں تو روز اس سے پان خریدتا ہوں“ انہوں نے مجھے سائیکل پر بٹھایا اور علی پور روڈ کی طرف چل پڑے۔

میڈن ہوٹل کے باہر سائیکل روکی اور ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

”وہ دیکھو انگریز عورت جو پان بیچتی ہے۔“

میں نے دیکھا کہ فٹ پاتھ پر دیوار کے ساتھ ایک انتہائی کالی کلوٹی مد راسی عورت پان سگریٹ کی چھابڑی سامنے رکھے بیٹھی تھی۔ راجہ صاحب نے ققمہ لگا کر کہا۔

”کیوں؟ ہے نہ پوری انگریز عورت!“

راجہ مہدی علی خان افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک کو بہت تنگ کیا کرتے تھے۔ ہمیشہ اس کی کنجوسی کو نشانہ بنا کر اسے چھیڑتے۔ اوپندر ناتھ اشک خالص ہوشیار پوری لہجے میں صرف یہی کہتا۔

”تمیں باز نہیں آئے گا راجیا؟“

مجھے معلوم نہیں کہ یہ لہجہ ہوشیار پوری تھا یا جالندھری۔ مگر اشک پنجابی اسی لہجے میں بولتا تھا۔

ایک خوشگوار شام کا ذکر ہے اور یہ شام میری یادوں کے جھروکوں میں اسی طرح روشن ہے۔ میری بہن اور کوشیلا سیر کرنے کو ارٹروں سے نکلیں۔ میں بھی راجہ کی سائیکل پر بیٹھا ان کے ساتھ تھا۔ کبھی سائیکل زور سے چلاتا ان سے آگے نکل جاتا اور کبھی ان کے ساتھ ساتھ سلو موشن میں سائیکل چلاتا چلا جاتا۔ ہم بڑی سڑک پر آئے جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا تو اوپندر ناتھ اشک کی بیگم کوشیلا نے رک کر آپا سے کہا۔

”پان تم ہم گھر پر ہی بھول آئے“

آپا کے پاس بڑا خوبصورت ایک پاندان ہوا کرتا تھا۔ وہ پان کھانے کی عادی تھیں۔ بات یہ ہوئی کہ آپا نے پان لگا کر نعمت خانے پر رکھے اور ساتھ لے جاتے وقت بھول گئیں۔

آپا نے مجھے گھر جا کر پان لانے کا آرڈر دیا۔ میں نے پیڈل پر ایک پاؤں کا سارا بوجھ ڈالا اور لہراتا ہوا سائیکل چلاتا ہوا سے باتیں کرتا کوارٹر پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ راجہ مہدی علی خان برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔

”اچھا تو پہلوان تم لے جاتے ہو شام کو میری سائیکل۔ اب میں تم سے اس کا کرایہ وصول کروں گا“

جب میں نے انہیں بتایا کہ میں پان لینے آیا ہوں تو وہ ہنس کر کہنے لگے۔
 ”ارے پہلوان! وہ پان تو میں کھا گیا ہوں چلو کوئی بات نہیں۔ میں خود پان لگا کر دیتا ہوں“

راجہ صاحب کچن میں گئے۔ اپنی پھولی ہوئی ہتھیلی پر باری باری پان رکھ کر کتھا چونا لگایا اور دونوں پان کانڈ میں لپیٹ کر مجھے دیئے اور کہا۔
 ”یہ لو پہلوان! مگر سائیکل آرام سے چلاتا“

میں پان لے کر چل پڑا۔ جب تک راجہ صاحب کی نظروں میں رہا سائیکل بڑے آرام سے چلاتا رہا۔ جو نہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئے میں نے سپیڈ پکڑ لی اور ہوا سے باتیں کرتا بیگم اشک کے پاس پہنچ گیا۔

دلی میں میرا کام شہر کی آوارہ گردی کرنا اور فلمیں دیکھنا تھا۔ شیشن کے ایک قریبی سینما گھر میں کار دار کی ایک فلم لگی جس کا نام میں بھول گیا ہوں۔ اس میں نرملا اور ارون نے کام کیا تھا ارون کو فلم میں کام کرتے دیکھ کر میرے دل میں ایکٹرن بننے کی جو چھپی ہوئی خواہش تھی وہ ایک بار پھر بیدار ہو گئی۔ ویسے بھی دلی کی آوارہ گردی سے میرا دل بھر گیا تھا۔ میں نے بڑی بہن سے کچھ پیسے لئے اور ایک روز فرنشیئر میل میں سوار ہو کر بمبئی روانہ ہو گیا۔ ریل گاڑیوں میں زیادہ رش نہیں ہوا کرتا تھا۔ فرنشیئر میل کے ڈبے سبز رنگ کے ہوتے تھے جو مجھے بہت پسند تھے۔ بارش میں یہ ریل گاڑی ہرے بھرے کھیتوں اور جنگلوں سے گذرتی تو مجھ پر وارفتگی سی طاری ہو جاتی۔ گاڑی دلی سے چلی تو نئی دلی کے شیشن پر تھوڑی دیر کو رکی۔ پھر نضال الدین پر رکنے کے بعد جو چلی تو طوفان میل کی رفتار سے چلتی مترا پہنچ گئی۔ پھر آگرہ کینٹ۔ پھر گوالیار۔ اس کے بعد جھانسی..... بھوپال کا شیشن کہیں رات کو آیا۔ رات بھر ٹرین جنگلوں، کھیتوں، درباروں پہاڑی علاقوں اور بستیوں کو پیچھے چھوڑتی آگے بڑھتی چلی

گئی۔ پو پھٹ رہی تھی کہ کھنڈو کا شیشن آگیا۔ کھنڈو اسٹیشن پر میں نے پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے دوپہر کا کھانا کھایا۔ پھر بھوسا ل ناسک اور دیوالی سے نکلتی ہوئی فرنیچر میل اگت پوری جا کر رک گئی۔

آگے کچھ چڑھائی تھی۔ ٹرین کے پیچھے بھی ایک بجلی کا انجن لگا دیا گیا۔ کافی دیر بعد ٹرین بمبئی کے مضافات میں داخل ہو گئی۔ کلیان، داور اور پھر ممبئی سنٹرل کا شیشن آ گیا۔ بمبئی میں میرا کوئی جاننے والا نہیں تھا لیکن اس بات کی میں نے کبھی پرواہ نہیں کی تھی۔ میں فلتے بھی کر سکتا تھا اور فٹ پاتھ اور ریلوے پلیٹ فارموں پر بھی سوتا رہا تھا۔ مقصد صرف ایڈو پنجر اور نئے نئے شہر نئے لوگ دیکھنے سے تھا۔ اس بار تو میں ایکٹر بننے کا پکا ارادہ کر کے دلی سے چلا تھا۔ آدمی سفر پر نکل پڑے تو کوئی نہ کوئی سبب بن ہی جاتا ہے۔ چنانچہ اس دفعہ بھی ایک لڑکے سے ملاقات ہو گئی جو اندھیری میں واقع پرکاش سٹوڈیوز میں کام کرتا تھا۔ چھ سات روز پرکاش سٹوڈیوز کے چکر لگاتا رہا۔ چھوٹی عمر تھی، بھلا میں کیسے ایکٹر بن سکتا تھا۔ اس سٹوڈیو میں مس پر میلا، کامیڈن آغا، گلاب اور دوسرے کئی فلمی اداکاروں کو دیکھا۔ شوٹنگ کا تھا کا دینے والا عمل دیکھ کر دل سے ایکٹر بننے کا خیال غائب ہو گیا۔ اب شہر کی آوارہ گردی کو نکل کھڑا ہوا۔ دن بھر شہر کی لمبی لمبی سیریں کیں، رات کو اپنے مسلمان دوست کی کھولی کو خیر باد کہا اور ممبئی ایکسپریس میں سوار ہو کر واپس دلی روانہ ہو گیا۔

نئی دلی کے شیشن پر اتر کر پیدل ہی میدان اور کچے ٹیلوں میں سے ہوتا ہوا تیس ہزاری کے کوارٹروں میں نکل آیا۔ میں چھوٹے سے ٹیلے سے اتر کر اپنے کوارٹر کی طرف آ رہا تھا کہ راجہ مہدی علی خان پر نظر پڑی۔ وہ سائیکل کوارٹر سے نکل کر دفتر جا رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو رک گئے۔ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ بمبئی ایکٹر بننے گیا ہوا ہوں۔ اس زمانے میں پنجاب سے جو بھی خوش شکل لڑکا گھر سے بھاگ کر بمبئی جاتا لوگ یہی سمجھتے کہ وہ فلمی اداکار بننے گیا ہے۔ راجہ مہدی علی نے مجھے دیکھتے ہی طنزیہ انداز میں کہا۔

”آگئے ہو پہلوان ایکسٹرن کے؟“

مجھے ان کی یہ بات بڑی بری لگی۔ غصے سے منہ پھلائے میں اپنے کوارٹر میں گھس گیا۔

ان ہی دنوں راجہ مہدی علی خان کی شادی کی بات شروع ہوئی۔ راجہ صاحب کی شادی لکھنؤ میں طے پائی تھی۔ یہ شادی میرے سامنے نہیں ہوئی۔ بارات تیس ہزاری والے کوارٹروں ہی سے گئی تھی اور بڑی بہن اور بھائی جان ایک طرح سے بارات لے کر لکھنؤ گئے تھے۔ مگر یہ سب کچھ میرے بعد ہوا۔ میں دلی سے کلکتے کی طرف نکل چکا تھا۔ لیکن جب شادی کی بات چل رہی تھی تو میں وہیں تھا۔ راجہ صاحب کو میری بڑی بہن پر اعتماد تھا۔ ایک روز میرے سامنے انہوں نے بڑی بہن سے کہا۔

”آپا! آپ لوگوں نے میری شادی کی بات تو شروع کر دی ہے مگر ذرا غور کرو میری اس سوراہی موٹی گردن کے ہوتے ہوئے مجھ سے کون لڑکی شادی کرے گی“

میں کسی مبالغے سے کلام نہیں لے رہا۔ یہ باتیں میرے سامنے ہوئی تھیں جو باتیں جو منظر مجھے یاد ہوتے ہیں وہ اپنی پوری تفصیل کے ساتھ مجھے یاد رہتے ہیں۔ اس وقت بھائی جان یعنی کیپٹن ملک بھی وہاں موجود تھے جن کی راجہ سے بڑی بے تکلفی تھی۔ بھائی جان نے کہا۔

”تو اس سوراہی گردن کو کچھ گھٹاؤ“

دوسرے دن سے راجہ مہدی علی خان نے روزانہ صبح کی سیر اور ورزش شروع کر دی۔ تیس ہزاری میں ہی ایک آموں کا باغ تھا۔ راجہ مہدی علی خان صبح سائیکل پر وہاں سیر کرنے جاتے، سائیکل ایک طرف رکھ کر گردن کو دائیں بائیں ہلا کر ورزش کرنی شروع کر دیتے۔ ڈنڈ بیٹھکیں بھی نکالتے۔ میں ان کے ساتھ ہوتا کیونکہ صبح کی سیر کا میں بچپن ہی سے عادی تھا۔ راجہ کا سانس بہت جلد پھول جاتا کیونکہ وہ بھاری بدن کے تھے، پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہتے۔

”پہلوان! یہ ورزش تو بڑی مہنگی پڑے گی، گردن پتلی ہونے کی بجائے کہیں اور

زیادہ موٹی نہ ہو جائے“

چھ سات دن ورزش کرنے کے بعد راجہ صاحب نے بھائی جان سے صاف صاف کہہ دیا۔

”ملک یار یہ کام مجھ سے نہیں ہوتا“ میں اپنی گردن کا منکا نہیں تڑوانا چاہتا۔ لڑکی والوں سے کہہ دو کہ اگر سو رکی گردن قبول ہے تو ہم بارات لے کر آجائیں گے“

بھائی جان نے یہ بات نہ م راشد کو بتا دی اور کہا کہ راجہ کی گردن نے پتلی ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ بات منٹو، اشک اور کرشن چندر کو بھی معلوم ہو گئی۔ انہوں نے مل جل کر راجہ کی گردن کی شان میں دو تین شعر گھر ڈالے جو مجھے آج بھی یاد ہیں۔

راجہ کی گردن بھینے کی گردن
 بھینے کی گردن راجہ کی گردن
 گینڈے کی گردن راجہ کی گردن
 گردن کی گردن راجہ کی گردن

لیکن اسی گردن کے باوجود راجہ کی شادی ہو گئی اور سنا ہے بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔

دوسری بار دلی آیا تو راجہ مہدی علی خان شادی شدہ تھے اور ابھی تک دلی ریڈیو پر ہی ملازمت کرتے تھے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا آخری روز تھا۔ راجہ صاحب پہلے سے زیادہ موٹے ہو گئے تھے اور گردن بھی کافی موٹی ہو چکی تھی۔ میں ریڈیو سٹیشن راشد صاحب کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ راجہ صاحب نمودار ہوئے۔ مجھے دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔

”پہلوان! تم تو بڑے ہو گئے ہو“

پھر مجھے ساتھ لے کر ریڈیو سٹیشن کی کینٹین پر آ گئے۔ چائے پلائی اور کچھ شاف

رہنماؤں سے بھی ملوایا جن میں سے مجھے ایک ہری چند چٹہ اور ایس ایس ایس ٹھاکر
 نا دھندلی سی شکلیں یاد رہ گئی ہیں۔ ٹھاکر کو وہاں تھری ایس ٹھاکر کے نام سے پکارا جاتا
 تھا۔ یہ بڑے کمال کے رامہ آرٹس تھے۔ بعد میں اخلاق احمد دہلوی سے ان لوگوں کے
 بارے میں بے حد دلچسپ باتیں سنیں۔ ان دنوں ریڈیو سٹیشن پر زیب نام کی ایک
 رامہ آرٹس خاتون تھیں۔ بعد میں انہوں نے فلم ایکٹر شیم سے شادی کر لی تھی۔
 مجھے یاد ہے زیب صاحبہ نے چو خانوں والا لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ راجہ مہدی علی نے
 کہا۔

”یہ ملتان کی کھیں کا کون ہے“

میں کچھ روز دلی میں رہا پھر برما کی طرف چل دیا۔

اس کے بعد راجہ مہدی علی خان سے پھر ملاقات نہ ہوئی۔ راجہ صاحب وہاں سے
 بمبئی چلے گئے اور فلمی دنیا میں شاعری شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے فلمی
 گیت برصغیر میں گونجنے لگے۔ وہ بڑے خوبصورت ادبی گیت اور غزلیں فلموں کے لئے
 لکھ رہے تھے۔ انہوں نے گاڑی بھی لے لی تھی۔ فلمی دنیا کا مشہور کامیڈین محمود ان کا
 ڈرائیور تھا۔ ایک بار اپنے انٹرویو میں کامیڈین محمود نے کہا تھا کہ میں نے اپنی فلمی
 زندگی کا آغاز راجہ مہدی علی خان صاحب کی ڈرائیوری سے شروع کیا اور وہی مجھے
 ہی دنیا میں لائے تھے۔ حالانکہ محمود کے والد خود فلمی دنیا کے بہت بڑے رقص
 ٹامبیڈین رہ چکے تھے۔ مگر محمود نے اعتراف کیا کہ میں راجہ صاحب کے پاس بطور شو فر
 ملازم تھا اور ان ہی کی وساطت سے مجھے ایک فلم میں چھوٹا سا رول ملا تھا۔ اس کے بعد
 محمود نے اپنی خداداد قابلیت کے باعث بہت ترقی کی اور بہت شہرت کمائی۔

راجہ مہدی علی خان کو قیام پاکستان کے بعد صرف ایک بار پردہ سیمیں پر دیکھا۔
 سعادت حسن منٹو ان دنوں بچے ٹائیز سے وابستہ تھے جس کا نام فلمستان ہو گیا تھا۔ منٹو
 نے ”آٹھ دن“ نام کی ایک فلم لکھی جس میں کچھ شاعروں ادیبوں نے بھی تھوڑا تھوڑا
 کام کیا تھا۔ افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک نے ایک پردہت کا رول ادا کیا۔ خود سعادت

حسن منٹو نے بھی ”آٹھ دن“ میں ایک نیم خبطی آدمی کا بڑا اہم کردار ادا کیا اور حیرانی کی بات ہے کہ بے حد کامیاب رہے۔ اسی قلم میں ایک بار شاعر میراجی بھی تھوڑی دیر کے لئے پردہ سیمیں پر نمودار ہوئے۔ شاید انہیں لیٹر باکس میں خط ڈالتے دکھایا گیا تھا۔ اس قلم میں راجہ مہدی علی نے باقاعدہ ایک کردار ادا کیا تھا۔ ان کا ایک سین مجھے آج بھی یاد ہے۔ راجہ صاحب عدالت میں پیش ہوتے ہیں۔ وہ گواہوں کے کھڑے میں کھڑے ہیں۔ جج صاحب پوچھتے ہیں۔

”کیا تمہارے پاس بندوق تھی؟“

راجہ صاحب جواب دیتے ہیں۔

”جناب! تھی بھی اور نہیں بھی تھی“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ جج صاحب تعجب سے پوچھتے ہیں، راجہ مہدی علی خان کہتے ہیں۔

”جناب! بندوق تھی اس لئے کہ تھی اور نہیں تھی اس لئے کہ خالی تھی“

سعادت حسن منٹو نے اس میں بڑے کمال کے مکالمے لکھے تھے۔ راجہ مہدی علی خان اپنی شہرت کے عروج پر تھے کہ ایک روز اخبار میں خبر چھپی کی راجہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کا چہرہ ان کا مسکراتا، صبح کی ورزش اور سائیکل چلانا، سب کچھ یاد آ گیا۔ مگر صرف یاد کر لینے سے کون واپس آتا ہے!





۱۹۹۷ء فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کی جانب سے انٹر نیشنل فلمی آفیسر رولڈ مہدی علی خان کو اعزاز عطا کیا گیا۔ مختصر موطا ہر اساطار لکھی
 انکم رولڈ مہدی علی خان ۱۱۔ جی۔ پی۔ کے ہاتھوں سے اعزاز حاصل کرتے ہوئے





رابعہ مہدی علی خاں ان کی اہلیہ طاہرہ سلطانہ مخنی اور بھانجے خالد صدیقی